BUDE-141

مرزا غالب کا خصوصی مطالعہ
Special Study of Mirza Ghalib

اسکول آف ہیومینیٹیز
اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، نئی دہلی

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

है और भी दुनिया में सुख़नवर बहुत अच्छे
कहते हैं कि 'ग़ालिब' का है अंदाज़-ए-बयाँ और

Block 1, 2, 3

بلاک 1،2،3

BUDE-141

مرزا غالب کا خصوصی مطالعہ

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی

اسکول آف ہیومینیٹیز

بلاک

2

غالب کی خصوصیات

بلاک 2 کا تعارف

اکائی 5

غالب کی غزل گوئی 69

اکائی 6

غالب کی منتخب غزلوں کی تشریحات 87

اکائی 7

غالب کی منتخب غزلوں کی تشریحات 101

اکائی 8

غالب کی قصیدہ گوئی 131

بلاک 2 تعارف

دوسرا بلاک **'غالب کی خصوصیات'** ہے۔اس بلاک میں کل 4 اکائیاں ہیں۔

اکائی5: 'غالب کی غزل گوئی'۔اس اکائی میں مرزا غالب کی غزل گوئی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی6: 'غالب کی منتخب غزلوں کی تشریحات'۔اس اکائی میں مرزا غالب کی منتخب غزلوں کی تشریحات پیش کی گئی ہیں۔

اکائی7: ''غالب کی منتخب غزلوں کی تشریحات'۔اس اکائی میں بھی مرزا غالب کی منتخب غزلوں کی تشریحات پیش کی گئی ہیں۔

اکائی8: 'غالب کی قصیدہ گوئی'۔اس اکائی میں مرزا غالب کے فنِ قصیدہ گوئی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 5 محمد اسداللہ خاں غالبؔ: حیات اور غزل گوئی

ساخت

5.1 اغراض ومقاصد
5.2 تمہید
5.3 حالاتِ زندگی
5.4 غالبؔ کی غزل گوئی
5.5 آپ نے کیا سیکھا
5.6 اپنا امتحان خود لیجیے
5.7 سوالات کے جواب
5.8 فرہنگ
5.9 کتب برائے مطالعہ

5.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں

- غالبؔ کے مختصر حالاتِ زندگی پیش کرنے کے بعد ان کی غزل گوئی کا جائزہ لیا گیا ہے۔
- امتحانی سوالات بھی بہ نمونہ ملیں گے۔
- فرہنگ کے تحت نئے الفاظ کے معنی دیے جا رہے ہیں۔
- اور آپ کے مطالعے کے لیے سفارش کردہ کتابوں کی فہرست بھی دی جا رہی ہے۔
- یقین ہے آپ ان سب کتابوں سے استفادہ کریں گے۔

5.2 تمہید

غالبؔ اردو کے بہت بڑے شاعر ہیں اور بلا شبہ وہ اپنی عہد کی آواز بھی ہیں۔ ان کی شاعری نئی اور پرانی تہذیب کے حسین پہلوؤں کا امتزاج ہے۔ انھوں نے اپنی تہہ دار شاعری میں سماج کو آئینہ دکھایا جس میں ہر شخص اپنے گرد وپیش کے حالات کا مشاہدہ کرسکتا ہے اور اس عہد کی دھڑکنوں کو محسوس بھی کرسکتا ہے۔ ان کے کلام کی مقبولیت کسی دور میں بھی کم نہیں ہوئی اور یقین ہے کہ ان کے پرستاروں کا دائرہ آئندہ اور بڑھے گا۔

غالب ہر دور کا ہر دل عزیز شاعر ہے۔ گزرتے ہوئے لمحوں نے اس کے فن کو گرد آلود کرنے کی بجائے اسے اور بھی نکھار دیا ہے۔ غالب کی شاعری بڑی پہلو دار اور تہہ دار ہے۔ اس میں بیک وقت دل و دماغ دونوں کو آسودہ کرنے کی صلاحیت ہے، ماضی، حال اور مستقبل ہر زمانے کی دھڑکنیں اس میں سنائی دیتی ہیں۔ اس میں پرانے اور نئے پن کا امتزاج ہے۔ غالب نے پرانے ذخیرے کا بہترین رس جذب کر کے اس پر نئے ذہن، فکر اور لب ولہجہ کا اضافہ کیا۔ اس لیے غالبؔ اردو غزل کی آبرو سمجھے جاتے ہیں۔ غالب سے پہلے اردو شاعری دل والوں کی دنیا تھی، غالبؔ نے اسے ذہن دیا۔ انھوں نے غزل میں نئے موضوعات اور نئے مضامین داخل کر کے اس کا دامن وسیع کر دیا۔

مغلیہ سلطنت کا زوال اگرچہ عہدِ غالبؔ سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا تاہم اتفاق ہی کہیے کہ وہ اس زمانے میں پیدا ہوئے جب سلطنتِ مغلیہ آخری سانسیں گن رہی تھی۔ دہلی میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی حکومت کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا۔ تعلیم، تمدن اور معاشرت کے لحاظ سے ملک پستی کی گہرائیوں میں گر چکا تھا۔ کون جانتا تھا کہ ان حالت اور اس ماحول میں ایک ایسا شاعر پیدا ہوگا جو نہ صرف اپنے پیش روؤں اور ہم عصروں میں برگزیدہ ہوگا بلکہ آنے والی نسلیں بھی اس کا نام عزت اور فخر کے ساتھ لیں گی اور اس کے کلام کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گی۔

اردو ادب میں غالب کو بہت بلند رتبہ حاصل ہے۔ وہ ہماری زبان کے بہت بڑے شاعر و نثر نگار بھی ہیں اور اس عہد کے سب سے نامور شاعر بھی۔ یہاں ہمیں ان کا مطالعہ ایک شاعر کی حیثیت سے کرنا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ پہلے وہ اسدؔ تخلص کرتے تھے لیکن جب ایک اور شاعر اسدؔ کا یہ شعر سنا۔

اسدؔ اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

تو اسدؔ تخلص ترک کر کے غالبؔ تخلص اختیار کیا۔

غالب انیسویں صدی کے عظیم شاعر ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت کو اردو شعرا و ادبا اور قدیم و جدید تمام نقادوں نے تسلیم کیا ہے۔ غالبؔ کی شخصیت اور ان کے فن پر اتنا زیادہ لکھا جا چکا ہے کہ اتنا اردو کے کسی اور شاعر پر شاید ہی لکھا گیا ہو۔ اسی وجہ سے غالب کی قدر و قیمت متعین کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے غالب کی شاعری کے ایسے کون سے پہلو ہیں جو ان کی عظمت کو بیان کرتے ہیں۔ آج غالبؔ کو گزرے ہوئے ڈیڑھ سو سال ہو رہے ہیں، کئی برسوں سے غالب اور ان کی شاعری کے مختلف موضوعات پر کام ہو رہا ہے لیکن آج بھی ان کی شخصیت اور شاعری کے نئے گوشوں کو کھولنے کی ضرورت ہے۔

5.3 حالاتِ زندگی

غالبؔ کا اصل نام مرزا اسد اللہ بیگ خاں تھا اور عرفیت مرزا نوشہ تھی۔ مغل بادشاہ کی طرف سے نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظام جنگ کے خطابات عطا ہوئے تھے۔ وہ 27 /دسمبر 1797 کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب افراسیاب بادشاہِ توران تک پہنچتا ہے۔ ان کے دادا مرزا قوقان بیگ خاں شاہ عالم کے زمانے میں ایران سے دہلی آئے۔ یہاں انھیں اعزاز و اکرام سے نوازا گیا اور پہاسو کا علاقہ بطور جاگیر عطا ہوا۔ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں ملازمت کے سلسلے میں مختلف مقامات پر رہے۔ آخر کار راجہ بختاور سنگھ کے ملازم ہوئے۔ 1802 میں کسی لڑائی میں مارے گئے۔ والد کے انتقال کے بعد چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں نے پرورش کی ذمہ داری قبول کی۔ یہ اکبر آباد کے صوبے دار تھے۔ مرزا صرف آٹھ برس کے تھے کہ چچا کا بھی انتقال ہوگیا اور پرورش کی ذمہ داری نانا پر آن پڑی۔ انھوں نے کبھی مرزا سے باز پرس نہیں کیا اور ہمیشہ لاڈ و پیار کا مظاہرہ کیا۔

مرزا نے ابتدائی تعلیم آگرہ کے مشہور عالم مولوی محمد معظم صاحب سے حاصل کی لیکن ان کی خوش قسمتی سے 1811 میں جب ان کی عمر 14 سال کی تھی ملا عبدالصمد نامی ایک ایرانی عالم جو نومسلم تھا سلسلہ سیر و سیاحت سے آگرہ آیا تھا، دو سال تک انھوں نے اس سے تعلیم حاصل کی۔ اس میں شک نہیں کہ ملا عبدالصمد فی الواقع ایک فارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے فارسی سیکھی تھی۔ شاعری کی ابتدا بچپن ہی سے ہوگئی تھی چنانچہ انھوں نے اپنی ایک فارسی غزل اپنے استاد مولوی معظم کی خدمت میں بغرضِ اصلاح اس وقت پیش کی تھی جب ان کی عمر دس سال سے زیادہ نہیں تھی۔

1810 میں جب ان کی عمر 13 سال تھی ان کی شادی نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوگئی اور 1812 میں انھوں نے اپنے آبائی وطن کو خیر باد کہہ کر دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔ غور سے دیکھا جائے تو اس نقلِ مکانی سے ان کی زندگی میں ایک انقلاب رونما ہوا۔ یہاں آ کر ان کی رسم و راہ بعض ایسے علم دوست حضرات سے ہوئی جن کی ذات سے انھیں گونا گوں علمی اور اخلاقی فوائد حاصل ہوئے۔

چچا کے انتقال کے بعد نواب احمد بخش خاں نے مرحوم کے وارثوں کے لیے انگریزی حکومت سے وظیفہ مقرر کرا دیا۔ جس میں سے سات سو روپیہ سالانہ مرزا کو بھی ملتا تھا۔ کچھ دنوں بہادر شاہ کے کلام پر بھی اصلاح دی، پچاس روپے ماہانہ یہاں سے بھی مقرر تھا۔ 1857 کا ہنگامہ ہوا تو انگریزی سلطنت نے مرزا کو باغیوں میں شمار کر کے پنشن بند کر دی، مغل سلطنت کا تو خاتمہ ہو ہی چکا تھا۔ مرزا کی گزر بسر مشکل ہوگئی۔ سو روپے مہینہ نواب رامپور کی سرکار سے ملتا تھا۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد

غالبؔ اپنی بے گناہی ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے اور انگریزی سرکار سے پنشن بحال ہوگئی۔ غالبؔ کو اپنے حسب ونسب اور شاعرانہ رتبے دونوں پر بڑا ناز تھا۔ وہ شاہانہ زندگی گزارنے کے خواہش مند تھے مگر یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔

مرنے سے چند روز پیشتر بے ہوشی طاری ہوگئی تھی۔ وفات سے ایک دن پہلے دماغ پر فالج گرا اور اسی بے ہوشی کی حالت میں 15 فروری 1869 کو ان کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت وہ تہتر برس کے تھے۔

5.4 غالبؔ کی غزل گوئی

غالبؔ کی شخصیت جامع الصفات تھی وہ ایک شاعر کی حیثیت سے تو معروف ہیں ہی، ایک نثر نگار کی حیثیت سے بھی ان کا پایہ بلند ہے۔ ان کے خطوط اردو میں جدید نثر کا سنگِ بنیاد ہیں۔ شاعری میں غالب نے قصیدے لکھے اور مثنویاں بھی لیکن جس صنف کی وجہ سے غالبؔ، غالب ہیں وہ ان کی غزل ہے۔ ''دیوانِ غالب'' کا زیادہ تر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ غالبؔ کے اردو کلام کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ان کی زندگی میں ''دیوان غالب'' پانچ بار چھپا۔ پہلی بار ''دیوانِ غالب''، مطبع سید الاخبار، دہلی سے چھپا جب کہ آٹھ سال قبل یعنی 1833 میں غالب اس کو مرتب کر چکے تھے۔ اس کا دیباچہ خود غالبؔ نے فارسی میں لکھا تھا۔ آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر و رخشاں (رئیسِ لوہارد) کی تقریظ ہے۔ یہ بھی فارسی میں ہے۔ دوسرا ایڈیشن ''مطبع دارالسلام، دلی'' سے مئی 1947 میں شائع ہوا۔ تیسرا ایڈیشن جولائی 1861 میں مطبع احمدی (شاہدرہ) دہلی سے چھپا جس کے آخری صفحہ پر انطباعِ دیوان کی تاریخ غالب کے عزیز شاگرد میرزا یوسف علی خاں کی لکھی ہوئی ہے ۔

لکھی عزیز خستہ نے تاریخ انطباع
حاسد کے سر کو، کاٹ کے دیوانِ ریختہ

مذکورہ بالا ایڈیشن میں بے شمار غلطیاں رہ گئی تھیں۔ چنانچہ مرزا نے خود غلطیوں کی تصحیح کی۔ یہ نسخہ محمد حسین خاں نے مطبع نظامی کانپور سے جون 1862 میں شائع کیا۔ پانچواں اڈیشن 1863 میں منشی شیونرائن نے اپنے مطبع مفید خلائق، آگرہ میں چھاپا۔ غالب ایک آفاقی شاعر تھے اس لیے ان کی زندگی میں ان کے دیوان کے پانچ ایڈیشن شائع ہوئے۔

غالب کو فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ انھیں اردو سے زیادہ اپنی فارسی دانی پر فخر تھا۔ انھوں نے کبھی اپنی فارسی شاعری پر ناز کرتے ہوئے اردو شاعری کو ''بے رنگِ من است'' کہا تو کبھی اردو شاعری کو رشکِ فارسی قرار دیا۔ ابتدا میں وہ فارسی شاعر بیدلؔ کی پیروی کرتے تھے ۔

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ کہنے کے باعث ان کے کلام میں فارسی کی آمیزش زیادہ ہوئی، ابہام اور اشکال بھی پیدا ہوئے، معمائی کیفیت بھی در آئی۔ مثلاً یہ اشعار ؎

شمارِ سبحہ ، مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردنِ صد دل پسند آیا
قمری کفِ خاکستر و بلبلِ قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

اس نوع کی شاعری نے غالب کے کلام میں چیستانیت اور الجھاؤ کی کیفیت پیدا کر دی اور لوگ کہنے لگے کہ یہ اپنا کہا آپ سمجھیں یا خدا سمجھے۔ ابتدا میں غالب نے اس بات کو یہ کہہ کر اڑا دیا تھا کہ ؎

نہ ستائش کی تمنا ، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

لیکن بعد میں ان کے قریبی احباب نے غالب کو اس مشکل پسندی سے باز رہنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ان کے بعد کی غزلوں میں مشکل پسندی کم ہوگئی اور بالعموم ان کے کلام میں سادگی، سلاست اور روانی کا احساس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

حالِ دل نہیں معلوم ، لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈھا ، تم نے بارہا پایا

ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا ، پر یاد آیا ہے
وہ ہر یک بات پر کہنا کہ ''یوں ہوتا'' تو کیا ہوتا؟

جان دی ، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غالبؔ کی کامیابی کا باعث ان کی صرف عام فہم الفاظ، تراکیب اور سیدھے سادے طرز کی شاعری

نہیں بلکہ مجموعی طور پر ان کا ڈکشن ہے جو پڑھنے والوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ الفاظ کا انتخاب، مصرعوں کا دروبست، زندگی اور زمانے کے تعلق سے ان کا رویہ، انسانی جذبات و احساسات کا درک، ان کے اشعار کی معنویت اور تہہ داری، ان کا پیرایۂ اظہار اور ان کا اندازِ بیان، ان کے کلام کو وزن و وقار بھی عطا کرتا ہے اور مقبولیت اور محبوبیت بھی۔ غالب کو الفاظ کے انتخاب میں بڑا کمال حاصل تھا۔ ہر چند کہ انھوں نے کہا ہے ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

لیکن ان مضامین کو اشعار کی صورت میں پیش کرنے کے لیے الفاظ کے انتخاب کا ہنر کچھ ان ہی کو آتا تھا۔ غالب الفاظ کے مزاج شناس تھے۔ ان کا دعویٰ بے جا نہیں کہ

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ، غالبؔ! مرے اشعار میں آوے

اس سلسلے میں سب سے پہلے تو ''دیوانِ غالب'' کے پہلے شعر پر ہی نظر پڑتی ہے ؎

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

ہمارے شارحین نے اس شعر کی جو تشریحات کی ہیں اور جو نئے نئے معانی نکالے اور مفاہیم پیدا کیے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے اس شعر میں معنی و مفہوم کی ایک دنیا آباد کر دی ہے۔ ذیل کے اشعار میں بھی غالب کا یہ ہنر نمایاں ہے ؎

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی — عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا
ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام — مہرِ گردوں ہے چراغ رہ گزارِ باد یاں
رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے — بھرے ہیں جس قدر جام و سبو، مئے خانہ خالی ہے
لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

غالبؔ کا اندازِ بیان ہی ہے جس نے ایک عالم کو گرویدہ کر لیا ہے۔ ان کے اشعار کا ڈکشن منفرد ہے۔ اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ غالب کے یہاں فکر اور موضوع کچھ اس طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ ان کے اسلوب میں طرح داری بھی پیدا ہو جاتی ہے اور تہہ داری بھی۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں ندرتِ خیال بھی ہے اور اندازِ بیان کی شگفتگی اور شستگی بھی ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو
غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
عشرتِ قتل گہہ اہلِ تمنا مت پوچھ عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

غالب نے کسی خاص فلسفے یا نظریے کو اختیار نہیں کیا۔ زندگی کے مختلف نظریوں، فلسفوں پر ان کی نظر ضرور تھی جن سے وہ متاثر بھی ہوئے لیکن حیات و کائنات کے بارے میں ان کی فکر خود ان کے اپنے مشاہدات و تجربات کا نچوڑ ہے۔ زندگی کو انھوں نے ہر رنگ میں دیکھا، اس کا جائزہ لیا اور اس کے تعلق سے ایک باشعور انسان کی طرح ردِعمل کا اظہار کیا۔ تصوف کے مسائل کے تعلق سے بھی ان کا یہی حال رہا۔ ان کے عہد میں تصوف کو زندگی کی ایک اہم قدر کی حیثیت حاصل تھی۔ صوفیانہ مسائل اور موضوعات پر غالب کی نگاہ تھی۔ انھوں نے ''یہ مسائل تصوف اور ترا بیان غالب'' کہہ کر تصوف سے اپنی دلچسپی کا اظہار بھی کیا ہے لیکن تصوف ان کے یہاں ''برائے شعر گفتن خوب است'' کی حد تک تھا۔ ویسے وہ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ تصوف کے بارے میں عام سوالات پر انھوں نے نشان لگا دیا ہے۔ چونکہ ان کا مطالعہ وسیع تھا، نظر میں گہرائی تھی اور بات کرنے کے ہنر سے واقف تھے اس لیے وہ جو بات بھی کہہ جاتے تھے متوجہ کرتی تھی۔ اس پس منظر میں ذیل کے اشعار کا مطالعہ کیجیے۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا
؎ عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے
شوق ہر رنگِ رقیب سر و ساماں نکلا قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی

غالبؔ پکے صوفی شاید اس لیے بھی نہیں بن سکے کہ انھوں نے دنیا اور علائقِ دنیا سے خود کو دور نہیں رکھا۔ انھیں اپنی پنشن کی بھی فکر تھی، دربار میں اعزاز و اکرام حاصل کرنا چاہتے تھے، اچھی شراب کی بھی خواہش تھی اور شہرت و ناموری کی بھی۔ ظاہر ہے ایسا شخص علمِ تصوف سے آگہی رکھنے کے باوجود صوفی نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تصوف کے مسائل پر گہری نظر ڈالی، اپنے اطراف و اکناف کی زندگی، اپنے ماحول، اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت، سیاست اور اپنے زمانے کی دلی کے بارے میں خوب خوب لکھا۔ ان کے خطوط میں تو یہ باتیں صاف صاف اور دوٹوک پیرائے میں ملتی ہیں لیکن ان کی غزلوں میں بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں جن کے عہد کے انتشار و اختلال، بے چینی و بحران، کشمکش اور آویزش کی ترجمانی ہوتی ہے۔ غالب نے زیست ہی نہیں کی، زیست کو برتا بھی۔

غالب کے دور کی تاریخ، مغلیہ سلطنت کے زوال اور معاشرت کے زیر و زبر کو ذہن میں رکھیے، ان اشعار کی معنویت فزوں ہو جائے گی ۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

قد و گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

غمِ عشق اور غمِ روزگار کے شدائد کے باوجود غالب نے اپنی شخصیت کو سنبھال کر رکھا۔ انھوں نے آفات و مصائب برداشت کیے، ایک غیر یقینی صورتِ حال کا سامنا کیا، شعر و ادب کے میدان میں مخالفتیں برداشت کیں لیکن بکھرے نہیں۔ ان کی شخصیت ٹوٹی نہیں، وہ ایک مکمل اور پورے آدمی رہے۔ ان کی خوش طبعی، مزاج کی شوخی اور طبیعت کی شگفتگی نے انھیں ناموافق حالات اور زندگی کے پیچ و خم سے گزرنے کا سلیقہ دیا۔ انھوں نے اپنے اشعار میں کئی جگہوں پر غم و اندوہ کی کیفیات اور احساس ذلت و ندامت کو ہنستے ہنستے ٹال دیا ہے۔ ''دیوانِ غالب'' میں ایسے کئی اشعار مل جائیں گے۔ مثلاً ۔

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئی
اٹھا، اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

کہاں مے خانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

غالب نے غزل کے علاوہ اور اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے قصیدے، مثنوی، رباعیات، قطعات اور مرثیے بھی لکھے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ غزل اور صرف غزل کے شاعر تھے۔ بقول رشید احمد صدیقی غزل اگر اردو شاعری کی آبرو ہے تو غالب اردو غزل کی آبرو ہیں۔ انھوں نے اردو غزل کو کہیں کا کہیں پہنچا دیا، غزل میں گہرائی پیدا کی، اس کو ایک تنوع سے آشنا کیا، اس کے درون میں ایک چمک اور مہک پیدا کی، خارجی طور پر تشبیہات و استعارات اور اشارات کے استعمال اور لہجہ و بیان کی طرفگی سے ان کی صورت ہی بدل دی۔ غالب نے اپنی شعر گوئی کے ابتدائی دور میں جب ان پر فارسی شعرا کا اثر تھا، مشکل اور دور از کار اور ادق تشبیہات، استعارات اور تلمیحات وغیرہ ضرور استعمال کیے جیسے جیسے انھوں نے سادگی کو اختیار کیا ان کے یہاں سہل، رواں دواں اور عام فہم تشبیہات، استعارات اور اشارات وغیرہ

ملتے ہیں۔اس رویے نے ان کی غزل کی دل کشی اور محبوبیت میں اضافہ کرتے ہوئے اس کی مقبولیت کے دائرے کو بہ غایت وسیع کر دیا۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
دیکھو تو دل فریبی اندازِ نقش پا　　موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند　　گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
کیا کیا خضر نے سکندر سے　　اب کسے رہنما کرے کوئی
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی　　اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

اسی کے ساتھ یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ غالب نے جہاں اردو شاعری کی روایت کی پابندی کی خود ان کی غزل اردو شاعری کی ایک روایت بن گئی، ایک منفرد آواز بن گئی جس کی ایک الگ پہچان ہے۔ غالب کی شاعری آنے والے دور کی بشارت اور نوید کی حیثیت رکھتی ہے۔ غالب کا ہمارے دور کے شاعروں پر نمایاں اثر ہے۔ غالب کے فن سے آج بھی خوشہ چینی کی جاتی ہے۔ ترقی پسند تحریک، اس کے بعد جدیدیت اور پھر آج کے دور کے شاعروں کے کلام کا مطالعہ کیجیے بالخصوص غزل کا، تو معلوم ہوگا کہ ان کے یہاں غالب کے کلام کی بازگشت اور اس کے اثرات ہیں۔

غالبؔ کی شخصیت ہو کہ شاعری اتنی تہہ در تہہ، ایسی پہلو در، ہمہ جہت اور طلسمی ہے کہ اس کی تفہیم جس قدر عام اور وسیع ہوتی جائے گی، ایسے گوشے سامنے آئیں گے جن کے بارے میں سوالات قائم کیے جاسکیں گے اور محققین، ناقدین اور شارحین کے لیے ایک نیا مواد اور ایک نئی دنیا سامنے آتی رہے گی اور یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔

5.5 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں

- آپ نے غالبؔ کی زندگی اور ان کی غزل گوئی کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔
- غالبؔ کی زندگی میں جو اتار چڑھاؤ آئے ان سے بھی آپ واقف ہوئے۔
- غالب کی غزلوں کی خصوصیات سے آپ نے آگہی حاصل کی اور یہ بھی معلوم کیا کہ غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کے کیا اسباب ہیں؟
- اس کے علاوہ یہ جانکاری حاصل کی کہ ''دیوانِ غالب'' کے کتنے ایڈیشن شائع ہوئے؟

5.6 اپنا امتحان خود لیجیے

1- غالبؔ کا پورا نام کیا تھا؟
2- غالب کب اور کہاں پیدا ہوئے تھے؟
3- غالب نے غزل کے علاوہ کن اصناف میں طبع آزمائی کی؟

4- غالبؔ نے کس فارسی شاعر کی پیروی کی؟

5.7 سوالات کے جوابات

1. غالبؔ کا پورا نام اسداللہ بیگ خاں تھا۔
2. غالب 27 دسمبر 1797 کو آگرہ میں پیدا ہوئے تھے۔
3. غالب نے قصیدے، مثنوی، رباعیات، قطعات اور مرثیے بھی لکھے۔
4. غالب نے فارسی شاعر بیدل کی پیروی کی۔

5.8 فرہنگ

الفاظ	معنی
خداداد	اللہ کی طرف سے، فطری
مشقت	محنت
چیستاں	معمہ، پہیلی
جامع الصفات	جس میں تمام صفات موجود ہوں
اشکال	مشکل، دشواری
آمیزش	ملاوٹ
اختلال	خلل ڈالنا، خلل پڑنا
تصوف	علم معرفت، دل سے خواہشوں کو دور کر کے خدا کی طرف دھیان لگانا
زیست	زندگی، حیات، عمر
امتزاج	آمیزش، ہم آہنگی
تقریظ	کتاب اور مصنف کی تعریف
آفات	آفت کی جمع، مصیبت، بلا
شرح	کھول کر کہنا، تفسیر، نرخ، بھاؤ
شارحین	شرح لکھنے والا

5.9 کتب برائے مطالعہ

1-	دیوانِ غالب	اسداللہ خاں غالب	غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2004
2-	غالب: شاعر و مکتوب نگار	پروفیسر نورالحسن نقوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 2000
3-	غالبؔ: شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1995
4-	غالبؔ: فکر و فن	پروفیسر اسلوب احمد انصاری	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1970
5-	یادگارِ غالبؔ	مولانا الطاف حسین حالی	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1982

اکائی نمبر 6 مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کی منتخب غزلوں کی تشریحات

ساخت

6.1 اغراض ومقاصد

6.2 تمہید

6.3 مرزا اسداللہ خاں غالبؔ: حالات زندگی، عہد اور شعری خصوصیات

6.4 مرزا اسداللہ خاں غالب کی غزل ''یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا'' متن کی تشریح

6.5 مرزا اسداللہ خاں غالب کی غزل ''ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا'' متن کی تشریح

6.6 مرزا اسداللہ خاں غالب کی غزل ''دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت'' متن کی تشریح

6.7 آپ نے کیا سیکھا

6.8 اپنا امتحان خود لیجیے

6.9 سوالات کے جواب

6.10 فرہنگ

6.11 کتب برائے مطالعہ

6.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- اردو کے عظیم شاعر اسداللہ خاں غالبؔ کی ہمہ جہت شخصیت کو جانیں گے
- غالب کے عہد اور ان کی حالاتِ زندگی کی جانکاری حاصل کریں گے
- غالبؔ کی ادبی خدمات کا مطالعہ کریں گے
- غالبؔ کے ہم عصروں کے بارے میں جانیں گے
- غالب کی طرزِ زندگی کی معلومات حاصل کریں گے
- غالب کے منتخب کلام کی تشریح کرنا سیکھیں گے

6.2 تمہید

مرزا اسداللہ خاں غالب بلاشبہ اپنے عہد کی غیر معمولی شخصیت اور عظیم شاعر ہیں۔ ذہن اور ذوق کے اعتبار سے اردو ادب کی تاریخ میں مرزا غالب منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری اور سوچ ان کے عہد کی روایات سے مختلف اور اعلیٰ تھے۔ وہ اردو اور فارسی زبان کے دانشور، عظیم مصنف اور فطری

شاعر تھے۔ان کی شاعری کسی جامِ جہاں نما سے کم نہیں۔ان کے اشعار میں تہہ در تہہ معنی کی حیران کرنے والی پوری دنیا آباد ہے۔

بلاے جاں ہے غالب اُس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

مرزا غالبؔ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔اردو اور فارسی زبان کے عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ہی وہ اردو اور فارسی کے اعلیٰ درجے کے نثر نگار بھی تھے۔غالب کی نثر خطوط کی شکل میں ہمارے سامنے آئی۔انہوں نے لکھنے کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔غالب نے اردو زبان میں روانی اور صفائی پیدا کی۔اسی لیے وہ 'نئی اردو نثر' کے بانی کہے جاتے ہیں۔جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے وہ ایک مشکل شاعر تصور کئے جاتے ہیں۔غالب کے اشعار کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے بڑی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔دیوان غالب میں زیادہ تر غزلیں ہیں۔کچھ قطعات، متفرقات اور قصائد بھی ہیں۔ غالب کے اشعار میں معنی کی کئی پرتیں ہوتی ہیں۔اسی لئے کلام غالب کو سمجھنے کے لئے بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔

6.3 غالب: حیات، عہد اور فن

مرزا اسداللہ بیگ خاں غالب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ عرف مرزا نوشہ 27 دسمبر 1797 میں بروز بدھ آگرہ شہر میں پیدا ہوئے۔غالب ترک خاندان سے تھے اور وہ اس کا ذکر فخریہ کرتے تھے۔غالب کے دادا قوقان بیگ خاں شاہ عالم کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔ان کی سات اولادیں تھیں جن میں چار لڑکے تھے اور تین لڑکیاں جن میں غالبؔ کے والد مرزا عبداللہ بیگ اور چچا نصر اللہ بیگ کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔قوقان بیگ خاں کی دوسری اولادوں کا تفصیلی ذکر نہیں ملتا۔ مرزا غالب کے والد کا نام مرزا عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولھا تھا جو دہلی میں پیدا ہوئے تھے اور ان کی والدہ کا نام عزت النساء بیگم تھا۔مرزا عبداللہ بیگ خاں کئی درباروں سے وابستہ رہے اسی لیے ان کی زندگی کی تفصیلات ملتی ہیں۔مرزا عبداللہ بیگ نے آبائی پیشہ سپہ گری اختیار کیا تھا۔مرزا غالب کی عمر صرف پانچ سال کی تھی جب ان کے والد جنگ کے میدان میں شہید ہوئے تھے۔

مرزا غالبؔ نے جب ہوش سنبھالا اس وقت مغلیہ سلطنت کی شمع آندھیوں کی زد میں تھی۔انگریزی حکومت قائم ہو رہی تھی۔شہنشاہ عالم کی حکومت قلعہ معلیٰ تک محدود رہ گئی تھی۔اس شکست و اضطراب کے ماحول میں مرزا غالب نے مایوس اور رنجیدہ نہ ہو کر حوصلہ اور ہمت عطا کیا اور ظلم برداشت کرنے کے قابل بنایا۔غالب کی شخصیت مشترکہ تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ مثال ہے۔ان کے دوستوں اور شاگردوں کا حلقہ متنوع اور رنگا رنگ تھا۔جس میں ہر مذہب اور طبقے کے لوگ شامل تھے۔ہرگوپال تفتہ، بال مکند بے صبر، شیونرائن آرام، منشی جواہر سنگھ جواہر، امید سنگھ، منشی نول کشور ان کے دوست اور

شاگرد تھے تو ولیم فریزر، ریٹی گن، اسٹرلنگ سے بھی ان کے گہرے رشتے تھے۔ وہ غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی انسان دوستی، انفرادیت، رنگارنگی اور آفاقیت میں ہی ان کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ ہم غالب کے بارے میں پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک مہذب انسان تھے۔ وسط انیسویں صدی کے تکلیف دہ ماحول میں بھی غالب کی طبیعت کا انبساط اور محفلوں میں ان کی بشاشت ایک پیامِ امید تھی۔ 15 فروری 1869! کو جب مرزا غالبؔ کا انتقال ہوا تو غالب کے خیالات میں تشیع کے اظہار کے باوجود ان کے رشتے داروں کے اصرار پر ان کی تجہیز تکفین سنی طریقے سے حضرت نظام الدین، دہلی میں کی گئی۔ اردو ادب میں مرزا غالب کی شخصیت غیر معمولی عظمت کی حامل ہے۔

غالب کے عہد اور اس کے ادبی پس منظر پر غور کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ غالب اس عہد میں زندہ تھے جہاں ایک نظام، ایک معاشرہ اور ایک تہذیب کی شمع ڈوب رہی تھی اور ایک نیا نظام، نیا معاشرہ اور ایک نئی تہذیب سر ابھار رہی تھی۔ مغلیہ سلطنت روبہ زوال تھی اور دہلی کی حکومت سمٹ کر لال قلعہ کی فصیلوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ غالب ان سب حالات و واقعات کے عینی شاہد ہیں۔ اسی لیے تو وہ کہتے ہیں کہ ؎

داغ فراق محبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

مرزا غالبؔ کا تعلق جس عہد سے ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس دور کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ 1857ء میں مغلیہ سلطنت کا آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ اس کی جگہ انگریز ہندوستان کے حکمراں بن بیٹھے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی مشرقی تہذیب دم توڑنے لگی تھی۔ انگریزوں کے ساتھ مغربی تہذیب بھی آئی۔ دو قوموں کی دو تہذیبیں باہم متصادم ہوئیں۔ مرزا غالبؔ اس دور کے سماجی و معاشی اور تہذیبی بدلتے حالات کے عینی شاہد تھے۔ غالبؔ مشرقی تہذیب کے دل دادہ تو ضرور تھے، لیکن اپنی مٹتی ہوئی تہذیب کے نوحہ خواں بھی تھے۔ اسی لیے غالبؔ انگریزوں کے سامنے سرنگوں تو نہ ہوئے لیکن ان سے کسی حد تک مرعوب ضرور تھے۔ یہی وجہ کہ غالبؔ نے کئی مقامات پر انگریزوں کی تعریف کی ہے۔

وقت اور حالات نے غالب کی شخصیت اور فکر کو مانجھ کر کچھ اس طرح چمکا دیا تھا کہ اس کی دمک آج بھی وہی ہے جو پہلے روز تھی۔ زندگی اور حالات غالب پر کس قدر نامہرباں رہے اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی عمر کے پانچویں سال یتیم ہو گئے جس چچا نے کم سن بھتیجے کے سر پر دست شفقت رکھا وہ بھی مرگ ناگہانی کا شکار ہوا۔ اس وقت غالب کی عمر محض نو سال تھی۔ سات

اولادیں ہوئیں لیکن ان میں سے ایک بھی برس ڈیڑھ برس سے زیادہ نہ جی سکا۔ایک بیٹا عارف گود لیا جو عین جوانی میں داغ مفارقت دے گیا۔خود ان کے سگے بھائی یوسف بیگ دیوانگی اور کسمپرسی کے عالم میں فوت ہوئے ۔ایسے حالات میں عام انسان ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے لیکن غالب نہیں ۔ غالب نے کتابیں کرائے پر حاصل کر کے پڑھیں، روزگار پر وظیفہ خواری کو ترجیح دی اس سب کے باوجود غالب غالب ہے کیونکہ وہ حالات وحوادث کو تماشا قرار دینے اور دنیا کو بازیچہ اطفال قرار دینے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

دہلی میں مستقل سکونت کے بعد مرزا غالبؔ نے دہلی سے باہر کلکتہ، رام پور اور میرٹھ جیسے شہروں کے سفر کیے۔ان میں سب سے لمبا سفر کلکتہ کا تھا۔اس شہر کا سفر انہوں نے پنشن کی بحالی کی غرض سے کیا تھا۔اس سلسلے میں وہ تقریباً تین سال دہلی سے باہر رہے۔اس سفر کے دوران انہوں نے لکھنو، الہ آباد، بنارس، پٹنہ اور بعض دوسرے شہروں میں بھی قیام کیا۔دراصل غالبؔ کو فیروز پور جھرکہ سے جو پنشن ملتی تھی اسے احمد بخش خان کے بیٹے نواب شمس الدین احمد خان نے بند کر دیا۔غالبؔ معاشی تنگی سے پریشان تھے اس لیے انہیں قانونی چارہ جوئی کے لیے کلکتہ کا سفر کرنا پڑا۔اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کا دارالحکومت کلکتہ شہر ہی تھا۔گورنر اسی شہر میں رہتا تھا۔اس کی انتظامیہ کونسل کے سامنے غالبؔ نے اپنا مقدمہ پیش کیا۔منت وسماجت کی، سفارشیں کرائیں، وظیفے کی بحالی کے لیے بڑی مشکلیں جھیلیں پھر بھی وہ کلکتہ سے خالی ہاتھ ہی لوٹے۔مرزا غالبؔ کلکتہ اپنی پنشن سے متعلق مقدمے کے سلسلے میں گئے تھے۔جسے وہ بحال کرانے میں ناکام رہے لیکن اس سفر سے مرزا غالبؔ کو بہت فائدے ہوئے۔شہر کلکتہ غالبؔ کو خوب پسند آیا۔انہوں نے اپنے خطوط اور نظموں میں یہاں کی آب وہوا اور آموں کی خوب تعریف کی ہیں۔وہ وہاں کے ادبی مشاعروں میں بھی شریک ہوتے رہے۔اس شہر میں ان کے کئی اچھے دوست بھی ہو گئے تھے جن سے تا حیات دوستانہ رہا۔کلکتہ میں غالبؔ کو ایک علمی معرکہ کا بھی سامنا کرنا پڑا جس کا ذکر انہوں ''بادمخالف'' نامی مثنوی میں کیا ہے۔اسی سفر کے دوران مرزا غالبؔ نے لکھنو میں چند ماہ قیام کیا۔لکھنو کے اہل علم نے ان کی خوب آو بھگت کی، لیکن بادشاہ غازی الدین حیدر اور اس کے نائب آغا میر کے دربار میں رسائی نہ ہوسکی۔لکھنو سے کانپور اور الہ آباد کے راستے بنارس پہنچے۔شہر بنارس مرزا غالبؔ کو بہت پسند آیا اور اس شہر کی تعریف میں فارسی زبان میں ایک مثنوی بعنوان ''چراغ دیر'' تحریر کیا۔مرزا غالب رام پور دو بار گئے۔پہلی مرتبہ 1860ء میں رام پور کا سفر کیا۔نواب یوسف خان غالبؔ کے علمی پرستار اور محسن تھے۔غالبؔ کی تنگ دستی کے زمانے میں انہوں نے بطور وظیفہ سو روپے ماہ وار مقرر کر دیا۔نواب یوسف مرزا غالبؔ کے شاگرد بھی تھے۔رام پور کے اہل علم میں غالبؔ کی بڑی قدر ومنزلت تھی۔ان کی صحبت سے اہل رام پور مستفیض ہوئیے۔رام پور کا دوسرا سفر غالب نے 1865ء میں کیا تھا جب نواب

یوسف خان کا انتقال ہوا تھا۔ان کے جاں نشیں نواب کلب علی خان نے بھی غالبؔ کو خوب عزت دی اوران کی خاطر داری کی۔انہوں نے بھی غالبؔ کا وظیفہ جاری رکھا۔1859ء میں غالبؔ نے میرٹھ کا سفر کیا۔اس وقت میرٹھ شہر میں ہی غالبؔ کے دوست نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ رہتے تھے۔ ان سے غالبؔ نے ملاقات کی۔شیفتہؔ اس زمانے کے بڑے بلند مرتبہ لوگوں میں تھے۔ان کے نام غالبؔ کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ شیفتہؔ سے ان کا والہانہ لگاؤ تھا۔

6.4 غالب کی غزل ''یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا'' متن کی تشریح

غزل (متن)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پہ جیے ہم، تو یہ جان، جھوٹ جانا — کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہدِ بودا — کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر استوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو — یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ، بنے ہیں دوست، ناصح — کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ، پھر نہ تھمتا — جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے — غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بری بلا ہے — مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا — نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا
اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دوئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا
یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان، غالب! — تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

تشریح :

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا

غزل کے مطلع میں شاعر فرما رہا ہے کہ محبوب سے ملن ہماری قسمت میں نہیں۔اچھا ہوا کہ موت نے نجات دلا دی ورنہ زندگی معشوق کے انتظار میں ہی گزرتی۔

ترے وعدے پہ جیے ہم، تو یہ جان، جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

شاعر کا کہنا ہے کہ محبوب کے وعدے کو سچ جانتا تو خوشی سے مر ہی جاتا۔اس بے اعتباری نے اس کی زندگی بچالی۔

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہدِ بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر استوار ہوتا

شاعر اپنے محبوب سے کہہ رہا ہے کہ ترا وعدہ بہت کمزور تھا۔ اگر مضبوط ہوتا تو تجھ جیسے نازک شخص سے نہیں ٹوٹتا۔

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا

معشوق کی ترچھی نظر کا تیر جو شاعر کے دل میں جا اٹکا ہے اس کی لذت اس کے سوا کوئی اور کیا جانے۔ اگر وہ تیر جگر کے پار ہو جاتا تو یہ خلش باقی نہیں رہتی۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ، بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

غالب کا کہنا ہے کہ دوستوں کا صرف یہ کام نہیں کہ معشوق سے دور رہنے کی نصیحت کرتے رہیں بلکہ انہیں محبوب سے ملاقات میں مددگار ہونا چاہیے۔

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ، پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا

شاعر کہہ رہا ہے کہ پتھر جیسی سخت چیز بھی عاشق کا غم برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر پتھر پر اس کا غم آشکارہ ہو جائے تو اس سے بھی خون ٹپکتا رہتا۔

غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

غم گرچہ جان گھلانے والا ہوتا ہے لیکن اس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ کیونکہ اگر عشق کا غم نہیں ہوتا تو یہ دل دنیا کے غم میں مبتلا رہتا۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا

شاعر کا ماننا ہے کہ روز روز کی موت سے ایک دن کا مرنا اچھا ہے۔ کس کس سے شبِ غم کا رونا روئیں۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

شاعر کا یہ ماننا ہے کہ مرنے کے بعد جس رسوائی اور بدنامی کا سامنا کرنا پڑا کہ نہ کوئی جنازہ اٹھانے والا

تھا نہ ہی کسی کو مزار کا پتہ معلوم تھا۔ اس لیے اچھا ہوتا کہ دریا میں ڈوب گیا ہوتا۔

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

اس شعر میں غالب نے خدا کی وحدت کو صاف صاف بیان کیا ہے کہ وہ ہر لحاظ سے یکتا اور بے مثال ہے۔ اس لیے اس کو کوئی نہیں دیکھ سکتا اگر دوئی کا شائبہ بھی ہوتا تو کہیں نہ کہیں ضرور دکھائی دیتا۔

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان، غالب!
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

یعنی غالب نے مسائلِ تصوف کو اتنے اچھے سے بیان کیا ہے کہ اگر وہ شرابی نہ ہوتے تو انہیں ولی سمجھا جاتا۔ غالب کو اپنی بادہ خواری کا بھی علم تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اپنی شاعری میں کتنے اہم موضوعات کو پیش کرتے ہیں۔

(شرح دیوان غالب، سعید الدین احمد)

6.5 غالب کی غزل ''ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا'' متن کی تشریح

غزل (متن)

1. ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا — آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
2. تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ — اُس میں کچھ شائبہ، خوبیِ تقدیر بھی تھا
3. تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں — کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا
4. قید میں ہے ترے وحشی کو، وہی زلف یاد — ہاں کچھ رنج گراں باریِ زنجیر بھی تھا
5. بجلی اِک کوند گئی آنکھوں کے آگے، تو کیا! — بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا
6. یوسف اُس کو کہوں، اور کچھ نہ کہے، خیر ہوئی — گر بگڑ بیٹھے، تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا
7. دیکھ کر غیر کو، ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا — نالہ کرتا تھا، ولے طالبِ تاثیر بھی تھا
8. پیشے میں عیب نہیں، رکھیے نہ فرہاد کو نام — ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا
9. ہم تھے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا، نہ سہی — آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا!
10. پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟
11. ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب! — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

تشریح:

(1) تم کو آنے میں جو دیر ہوگئی ہے تو کیا کسی نے روک لیا تھا۔ آخر تاخیر کی کیا وجہ ہے۔ بدگمانی کا اظہار کیا ہے۔

(2) مطلب یہ کہ تمہارا کوئی قصور نہیں۔خود میری قسمت میں ہی تباہی لکھی تھی۔

(3) مطلب یہ ہے کہ تجھ کو یاد ہوگا کہ کبھی تیرے شکار بند میں کوئی شکار پھنسا تھا۔بس میں وہ ہی ہوں۔

(4) یعنی قید میں تیری زلف کی یاد کے علاوہ کچھ تھوڑی سی تکلیف زنجیر کی بھی تھی (گو، قید کی تکلیف یاد، زلف معشوق کی بے چینی کے مقابلے میں بالکل حقیر تھی۔

(5) اس کا مطلب ہے کہ وہ جو آن کی آن میں اپنا ذرا جلوہ دکھا کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تو اس سے کیا تسلی ہوسکتی ہے۔اس طرح بیان کیا ہے ''بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا'' ان کو لازم تھا کہ وہ مجھ سے گفتگو بھی کرتے۔کیونکہ مجھ کو بات کرنے کی بھی تمنا تھی۔

(6) میرے اس کو یوسف کہنے پر اگر وہ خاموش رہا تو بہت ہی خیریت ہوئی۔ورنہ اگر وہ بگڑ جاتا کہ میں نے اس کو اس کسے کمتر سے تشبیح دی۔یا جیسا کہ بعض شارحین کی رائے ہے کہ میں نے اس کو غلام بنایا۔تو وہ بالکل حق بجانب تھا۔واقعی میں اس غلطی پر قابل سزا تھا۔

(7) مصرعہ ثانی میں نالا سے پہلے لفظ غیر محظوف ہے۔

(8) یعنی لوگ یہ کہتے ہیں کہ فرہاد نے جو رقیب کے لئے کوہکنی کی وہ عیب ہے۔لیکن یہ درست نہیں۔کوہ کنی اس کا پیشہ تھا اور پیشہ شرعاً یا اخلاقاً عیب نہیں ہے اس لئے ہم اس کو اپنی جماعت سے خارج نہیں کر سکتے۔

(9) یعنی اگر پاس آنا پسند نہ تھا تو نہ آیا ہوتا۔دور سے ہی ایک تیر (نگاہ) لگایا ہوتا۔

(10) شوخی طبع ملاحظہ طلب ہے۔مطلب یہ ہے کہ ہمارے جرم کے ثبوت کے لئے کسی شہادت کی ضرورت ہے۔صرف فرشتوں کا لکھنا کافی نہیں۔ہم محض ان کے لکھنے پر کیوں پکڑے جاتے ہیں؟

(11) ریختہ بہ معنی زبان اردو۔غالب کے عہد تک فارسی میں شعر کہنا کمال سمجھا جاتا تھا۔اردو میں بھی شعر کہہ لینا بس یوں ہی اک بات تھی۔لیکن غالب نے بہ زبان اردو بہترین اشعار کہے۔خود غالب کو بھی اپنے مقام و مرتبے کا اندازہ تھا۔اس شعر میں میر تقی میر کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے غالب کہتے ہیں کہ اے میاں غالب آپ ضرور ریختے کے استاد ہیں لیکن آپ سے پہلے بھی ایک بڑا استاد گزرا ہے جسے میر تقی میر کہتے ہیں۔

6.6 غالب کی غزل ''دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت'' متن کی تشریح

غزل (متن)

1. دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں
2. دَیر نہیں، حرم نہیں، دَر نہیں، آستاں نہیں بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم، غیر ہمیں اُٹھائے کیوں!

3. جب وہ جمالِ دلفروز، صورتِ مہرِ نیم روز — آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منھ چھپائے کیوں!
4. دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ — تیرا ہی عکسِ رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں!
5. قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے، آدمی غم سے نجات پائے کیوں!
6. حُسن اور اُس پہ حسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم — اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں!
7. واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع — راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں!
8. ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی — جس کو ہو دین و دل عزیز، اُس کی گلی میں جائے کیوں!
9. غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں! — روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں!

تشریح :

(1) معشوق عاشق کی گریہ وزاری سے تنگ و آزردہ ہو کر اس کو منع کرتا ہے کہ آخر کیوں روتے ہو؟ آخر کیوں روتے ہو؟ کوئی وجہ بھی ہے؟ اس کے جواب میں عاشق کہتا ہے کہ روئیں کیسے نہیں! آخر ہم بھی دل رکھتے ہیں۔ اس میں کہاں تک ظلم کی برداشت ہو۔ کوئی اینٹ پتھر تو ہے نہیں کہ کچھ اثر ہی نہ ہو۔ اگر آپ کو یہ منظور ہے کہ ہم نہ روئیں تو ستانا چھوڑ دیجئے۔ ورنہ ہم بھی اچھے روئیں گے۔ آخر ہمیں کوئی کیوں ستائے؟

(2) مطلب یہ ہے کہ میں نہ مندر میں بیٹھا ہوں نہ مسجد میں نہ کسی کے دروازے پر نہ کسی کے چوکھٹ پر بلکہ راہ عام پر بیٹھا ہوں جو کسی کی بھی ملکیت نہیں ہے۔ پھر وہ (غیر) ہم کو وہاں سے کیوں اٹھاتا ہے۔

(3) مطلب یہ ہے کہ جس طریقہ سے دوپہر کو سورج کی طرف نہیں دیکھ سکتے اسی طریقہ سے جبکہ میرے محبوب کا جمال دلفروز اپنے آپ ہی نظارہ سوز ہو تو پھر اس کو پردے میں منہ چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ منہ چھپانے سے جو فائدہ تھا وہ اب بھی حاصل ہے کہ اس کا نظارہ نہیں ہو سکتا۔ حاصل یہ ہے کہ وہ مستور نہیں ہے۔ اس کا جلوہ نظارہ سوز ہے جس کی وجہ سے ہم محروم ہیں۔

(4) مطلب یہ ہے کہ تیرا دشنۂ غم جاں ستاں (جان لینے والا) ہے اور نقوک ناز بے پناہ ہے۔ (یعنی اس سے پناہ نہیں مل سکتی) جب تیری یہ حالت ہے تو پھر میں نہیں چاہتا کہ کوئی بھی خواہ تیرا عکس ہی کیوں نہ ہو، تیرے سامنے آئے ورنہ وہ بھی تباہ ہوگا۔

(5) مطلب یہ ہے کہ اصل میں حیات و غم ایک ہی چیز ہیں تو پھر مرنے سے پیشتر غم سے کیوں کر نجات مل سکتی ہے۔

(6) دوسرے مصرعے میں غیر کے معنی بھی رقیب کے ہیں۔ مرزا صاحب نے خود ایک خط میں اس کی شرح لکھی ہے۔ لکھتے ہیں ''حسن عارض اور حسن زن دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں یعنی صورت اچھی ہے اور گمان اس کا صحیح ہے۔ کبھی خطا نہیں کرتا۔ اور یہ گمان اس کو اپنی نسبت ہے کہ میرا مارا کبھی بچتا نہیں ہے۔ اور میرا تیر غمزہ خطا نہیں کرتا۔ پس جب اس کو ایسا بھروسہ ہے تو رقیب کا امتحان کیوں کرے۔ اس حسن زنی نے رقیب کی شرم رکھ لی ورنہ رقیب عاشق

صادق نہ تھا۔ اگر پائے امتحان درمیان آتا تو حقیقت کھل جاتی۔''

(7) اس شعر میں صنعت لف ونشر غیر مرتب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم کو تو حجاب پاس وضع مانع ہے۔ اس لئے اس سے راستے میں نہیں ملتے۔ (کیوں کہ یہ وضع کے خلاف ہے۔) اور اس کو اپنے عز و ناز پہ غرور ہے اس لئے وہ مجھ کو محفل میں نہیں بلاتا۔ پھر ملاقات ہو تو کیسے ہو؟

(8) ''ہاں اور جاؤ'' پر ذرا زور دے کر پڑھنے سے مطلب صاف ہو جاتا ہے۔ لوگ عاشق کو سمجھاتے ہیں کہ معشوق بڑا بے وفا اور کافر ہے۔ عشق سے باز آؤ۔ فضول دین و دل کیوں گنواتے ہو۔ تو اس پر برہم زدہ ہو کر کہتا ہے کہ اگر وہ بے وفا اور کافر ہے تو ہونے دو کوئی حرج نہیں۔ میں اس کو ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ یہ دونوں چیزیں اس کے پیچھے کھو دوں۔ تم کو اگر دین و دل عزیز ہے تو تم اس کافر اور بے وفا کے کوچہ میں مت جاؤ۔

(9) شاعر اپنے مرنے کے بعد زبان حال سے اپنے احباب کو تسکین دیتا ہے کہ رونے کی کیا بات ہے۔ صبر کرنا چاہئے۔ اگر وہ مر گیا ہے تو مر جانے دو۔ تم کو اس سے فائدہ ہی کیا تھا۔
(شرح دیوان غالب، سعید الدین احمد)

6.7 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ

- مرزا غالبؔ کی شخصیت سے واقف ہوئے۔
- مرزا غالبؔ کی حالات زندگی کو تفصیل سے جانا اور سمجھا۔
- مرزا غالبؔ کے معاصرین کے بارے میں واقفیت حاصل کی۔
- غالبؔ کی ادبی خدمات کے بارے میں تفصیل سے سمجھا۔
- غالبؔ کے عادات واطوار اور ان کے اسفار کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔
- غالب کی منتخب غزلوں کا مطالعہ کیا اور تشریح بھی دیکھ سکے۔

6.8 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ مرزا غالبؔ کب اور کہاں پیدا ہوئے تھے؟ اور کہاں کس مقام پر ان کی وفات ہوئی؟
2۔ غالب نے شہر بنارس کے حوالے سے کون سی مثنوی لکھی تھی؟
3۔ غالب کی شادی کب اور کس سے ہوئی؟
4۔ غالب کے والد اور والدہ کے نام کیا تھے؟
5۔ غالبؔ کے پانچ معاصرین ادیب کون کون تھے؟

6.9 سوالات کے جواب

1۔ غالبؔ 27 دسمبر 1797 کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ غالب کی وفات 15 فروری 1869 کو دہلی میں ہوئی تھی۔

2۔ شہر بنارس کے حوالے سے غالب نے ''مثنوی چراغ دیر'' لکھی تھی۔

3۔ غالبؔ کی شادی 1810ء میں 13 سال کی عمر میں امراؤ بیگم سے ہوئی۔ اس وقت امراؤ بیگم کی عمر محض 11 سال کی تھی۔

4۔ مرزا غالب کے والد کا نام مرزا عبداللہ بیگ خان اور والدہ کا نام عزت النسا بیگم ہے۔

5۔ غالبؔ کے معاصرین ادیبوں میں استاد شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، شاہ نصیر، مومن خاں مومنؔ، بہادر شاہ ظفرؔ اور نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ کے نام اہم ہیں۔

6.10 فرہنگ

لفظ	معنی
وفات	موت
شاہد	گواہ
سانحہ	واقعہ، حادثہ
طفولیت	بچپن، بالکپن
قماربازی	جوا کھیلنا۔ شرطیہ بازی
خفا	ناراض
خودداری	غیرت، ثابت قدمی
معلم	استاد
تجویز	رائے، مشورہ
حیوان ظریف	خوش طبع۔ ہنس مکھ
خوش اخلاق	عمدہ اخلاق
صاف گو	سچا، کھری بات کہنے والا
ملازمت	نوکری
عہدہ	منصب، مرتبہ
استقبال	خوش آمدید
سنگ میل	میل کا پتھر جو راہ گیروں کی رہنمائی کا کام کرتا ہے
آفتاب	سورج

غروب	ڈوب جانا
حکمراں	برسر اقتدار، صاحب حکومت
عینی	آنکھوں دیکھا
دل دادہ	فریفتہ، عاشق، گرویدہ
چشم پوشی	آنکھ چرانا، نظر انداز کرنا
مرعوب	ڈرا ہوا
مستقل	ہمیشہ کے لیے
پنشن	وظیفہ
چارہ جوئی	فریاد، نالش
دارالحکومت	راجدھانی
منت وسماجت	پیروی، التجا
سفارش	کسی کی بھلائی یا مطلب برآری کے لیے دوسرے سے کلمات خیر کہنا
معرکہ	لڑائی، جنگ
قیام	مقیم۔فروکش، مستقل ایک حالت پر قائم
ماہوار	مہینے کے مہینے
مستفیض	فیض یاب، فیض اٹھایا
جاں نشیں	سلطنت کے نائب

6.11 کتب برائے مطالعہ

1۔	الطاف حسین حالی	یادگار غالب	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، 1986
2۔	شمس الرحمٰن فاروقی	تفہیم غالب	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، 2006
3۔	شان الحق حقی	آئینہ افکار غالب	ادارہ یادگار غالب کراچی، 2001
4۔	عبادت بریلوی	غالب اور مطالعہ غالب	سکسینہ پبلشنگ ہاؤس دہلی، 1970
5۔	مولانا غلام رسول مہر	دیوان غالب	شیخ غلام علی اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلیشر لاہور، 1967
6۔	مختار الدین احمد	احوال غالب	انجمن ترقی (ہند) دہلی، 1953ء
7۔	آغا محمد باقر	بیان غالب	کتابی دنیا دہلی، 2000
8۔	تنویر احمد علوی	غالب کی سوانح عمری	غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی، 2004

اکائی نمبر 7 غالبؔ کی منتخب غزلوں کی تشریحات

ساخت

7.1 اغراض ومقاصد

7.2 تمہید

7.3 غالبؔ: حالات زندگی، عہد اور شعری خصوصیات

7.4 غالبؔ کی غزل ''آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک'' متن کی تشریح

7.5 غالبؔ کی غزل ''بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا'' متن کی تشریح

7.6 غالبؔ کی غزل ''پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا'' متن کی تشریح

7.7 غالبؔ کی غزل ''درد منت کش دوا نہ ہوا'' متن کی تشریح

7.8 آپ نے کیا سیکھا

7.9 اپنا امتحان خود لیجیے

7.10 سوالات کے جواب

7.11 فرہنگ

7.12 کتب برائے مطالعہ

7.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- غالبؔ کی شخصیت سے واقف ہوں گے
- غالبؔ کی ادبی خدمات کے متعلق معلومات حاصل کریں گے
- غالبؔ کے معاصرین کے بارے میں جانیں گے
- آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ غالبؔ نے کن شہروں کا سفر کیا
- غالبؔ کے اخلاق و عادات سے متعلق بحث ہوگی
- غالب کے منتخب کلام کا مطالعہ تشریح کے ساتھ کرسکیں گے

7.2 تمہید

مرزا غالبؔ اپنے عہد کے نمائندہ اور آفاقی شاعر ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں مرزا غالبؔ کا نام غیر

معمولی عظمت کا حامل ہے۔ وہ اردو اور فارسی زبان کے دانشور، عظیم مصنف اور فطری شاعر تھے۔ مرزا غالبؔ کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ وہ جتنے بڑے اردو اور فارسی زبان کے شاعر تھے اتنے ہی بڑے اردو اور فارسی کے نثر نگار بھی تھے۔ انہوں نے شعر و شاعری کے علاوہ تاریخ نویسی میں بھی اپنے علم و ہنر کا لوہا منوایا۔ اردو ادب کی تاریخ میں غزل کو اردو شاعری کی آبرو کا درجہ حاصل ہے تو مرزا غالب اس آبرو کی شناخت ہے۔ مرزا غالب کا شمار اردو کے فلسفی شاعروں میں بھی ہوتا ہے۔ غالب کے اشعار میں معنی کی کئی پرتیں ہیں۔ غالب کے بیشتر اشعار ایسے ہیں جن پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ان کی شاعری میں موضوعات کا تنوع ہے۔ انسانی زندگی کے تمام رنگ غالب کی شاعری میں موجود ہیں۔ غالب کے اشعار فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ اسی لئے غالب کے کلام کی مختلف شرحیں لکھی گئیں۔ کلام غالب کو سمجھنے سمجھانے اور تفہیم غالب کی راہیں ہموار کرنے کے لئے مولانا حسرت موہانی، نظم طباطبائی، بیخود موہانی، یوسف سلیم چشتی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مالک رام، کالی داس گپتا رضا، خلیق انجم اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسے اہل علم کی کتابیں موجود ہیں۔ غالب کے اشعار کی تشریح بھی ایک مشکل کام ہے۔ کبھی کبھی معنی کی ایسی پرتیں ہوتی ہیں جنھیں عبور کرنا آسان نہیں ہوتا ہے۔

7.3 غالب : حالات زندگی، عہد اور شعری خصوصیات

مرزا غالبؔ کا اصل نام مرزا اسداللہ بیگ خاں ہے۔ عرفیت مرزا نوشہ تھی۔ 27 دسمبر 1797 میں بروز بدھ آگرے میں پیدا ہوئے۔ دہلی کے ایک معزز خاندان میں اسداللہ خاں کی شادی ہوئی، شادی کے بعد وہ آگرہ سے دہلی منتقل ہو گئے۔ ان کے والد مرزا دولہا کی نسبت سے انہیں مرزا نوشہ کے نام سے یاد کیا اور دہلی میں اسی عرفیت کے ساتھ وہ مشہور ہوئے۔ پہلے 'اسد' کے نام سے شعر کہتے تھے۔ بعد میں کسی اسد نامی شاعر کے بارے میں سنا تو انہوں نے غالبؔ تخلص اختیار کیا۔ دبیر الملک، نجم الدولہ اور نظام جنگ جیسے خطابات شاہی دربار سے غالبؔ کو عطا کیے گیے۔ استاد شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے بعد بہادر شاہ ظفر کے استاد بھی مقرر ہوئے۔ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں ایک بہادر سپاہی تھے۔ مرزا غالبؔ کی والدہ کا نام عزت النسا تھا جو ایک معزز خاندان کی تعلیم یافتہ اور نیک دل خاتون تھیں۔ غالبؔ کا تعلق ایک معزز خاندان سے تھا۔ غالبؔ خود کو پشنگی اور افراسیابی کہتے تھے۔ پشنگ افراسیاب کے باپ کا نام تھا۔ افراسیاب قدیم ترکستان یا تورانی قبائل کا ایک معروف اور طاقتور شخص تھا۔ غالب اپنے آبائی حسب نامے کے مطابق ترک سلجوقی ہیں۔ سپہ گری اس خاندان کا محبوب پیشہ تھا۔

غالبؔ کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ مرزا غالبؔ کے والد مرزا عبداللہ نے بھی اپنے آبائی پیشہ سپہ گری کو اختیار کیا۔ عبداللہ بیگ پہلے لکھنو کے آصف الدولہ کے دربار میں ملازم ہوئے۔ اس کے بعد حیدرآباد کے نظام علی خان کی فوج میں تین ہزار فوجوں کے ساتھ شامل

ہوگئے۔وہاں سے آگرہ چلے آئے، جہاں سکونت اختیار کی۔الور کے راجہ بختاور سنگھ کی فوجی کمان سنبھالی 1802 میں راج گڑھ کی معرکہ آرائی میں مرزا عبداللہ جنگ کے میدان میں شہید ہوگئے۔ اس وقت مرزا غالبؔ کی عمر صرف پانچ سال کی تھی۔غالبؔ کل تین بھائی بہن تھے،سب سے بڑی بہن چھوٹی خانم اور چھوٹا بھائی مرزا یوسف۔مرزا غالبؔ کے والد کی وفات کے بعد ان کے چچا نصراللہ بیگ نے مرزا غالبؔ کی کفالت کا بار اپنے ذمہ لے لیا۔نصراللہ خاں کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی اس لیے انہیں اپنے بھائی کی اولادوں سے بے انتہا محبت تھی۔انہوں نے ان کی پرورش و پرداخت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔مرزا نصراللہ آگرہ میں مرہٹوں کی طرف سے صوبے دار تھے۔انگریزوں کے اقتدار میں آنے کے بعد انہیں رسالدار بنا دیا گیا۔آگرہ کے دو پرگنے سونس اور سونسہ کے علاقے بطور جاگیر انہیں عطا کیے گیے تھے۔مگر مشیت ایزدی کچھ اور ہی تھی۔1806 کو مرزا نصراللہ بیگ ہاتھی سے گرکر شدید طور پر زخمی ہوگئے۔اس حادثے کے بعد ان کی وفات ہوگئی۔اس وقت غالبؔ کی عمر آٹھ برس کی تھی۔اس طرح غالبؔ چچا کی کفالت اور شفقت سے بھی محروم ہوگئے۔نصراللہ بیگ خاں کے پس ماندگان کی پرورش کے لیے انگریز حکام نے وظیفہ مقرر کردیا،جس میں سے ایک مخصوص حصہ مرزا غالبؔ کو بھی ملتا تھا۔بعد میں غالبؔ کے حصے کی رقم روک دی گئی۔جس کے لیے مرزا غالبؔ نے مقدمہ بازی بھی کی اور بہت تکلیفیں اٹھائیں۔

مرزا غالبؔ کی شادی 13 برس کی عمر میں امراؤ بیگم سے ہوئی، جو اس وقت 11 سال کی تھیں۔امراؤ بیگم دہلی کے نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کی چھوٹی بیٹی تھیں۔غالبؔ کے خسر محترم نواب معروفؔ ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔شاہ نصیرؔ سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ان کا دیوان بھی شائع ہوچکا ہے۔نواب معروفؔ ایک نیک طینت اور شریف النفس انسان تھے۔دہلی کے معزز رئیسوں میں ان کا نام تھا۔وہ فیروز پور جھرکہ کے فرمارواں نواب احمد بخش رستم جنگ اور رئیس لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے۔

مرزا غالبؔ کا تعلق جس عہد سے ہے۔ہندوستان کی تاریخ میں اس دور کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔1857 میں مغلیہ سلطنت کا آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔اس کی جگہ انگریز ہندوستان کے حکمراں بن بیٹھے۔سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی مشرقی تہذیب دم توڑنے لگی تھی۔انگریزوں کے ساتھ مغربی تہذیب بھی آئی۔دو قوموں کی دو تہذیبیں باہم متصادم ہوئیں۔مرزا غالبؔ اس دور کے سماجی و معاشی اور تہذیبی بدلتے حالات کے عینی شاہد تھے۔غالبؔ مشرقی تہذیب کے دل دادہ تو ضرور تھے،لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کی روز بروز بڑھتی سیاسی اثر ورسوخ سے وہ خود چشم پوشی بھی نہیں کرسکتے تھے۔اسی لیے غالبؔ انگریزوں کے سامنے سرنگوں تو نہ ہوئے لیکن ان سے کسی حد تک مرعوب ضرور تھے۔

دہلی میں مستقل سکونت کے بعد مرزا غالبؔ نے دہلی سے باہر کلکتہ، رام پور اور میرٹھ جیسے شہروں کے سفر کیے۔ ان میں سب سے لمبا سفر کلکتہ کا تھا۔ اس شہر کا سفر انہوں نے پنشن کی بحالی کی غرض سے کیا تھا۔ اس سلسلے میں وہ تقریباً تین سال دہلی سے باہر رہے۔ اس سفر کے دوران انہوں نے لکھنو، الہ آباد، بنارس، پٹنہ اور بعض دوسرے شہروں میں بھی قیام کیا۔ دراصل غالبؔ کو فیروز پور جھرکہ سے جو پنشن ملتی تھی اسے احمد بخش خان کے بیٹے نواب شمس الدین احمد خان نے بند کر دیا۔ غالبؔ معاشی تنگی سے پریشان تھے اس لیے انہیں قانونی چارہ جوئی کے لیے کلکتہ کا سفر کرنا پڑا۔ مرزا غالبؔ کلکتہ اپنی پنشن سے متعلق مقدمے کے سلسلے میں گئے تھے۔ جسے وہ بحال کرانے میں ناکام رہے لیکن اس سفر سے مرزا غالبؔ کو بہت فائدے ہوئے۔ شہر کلکتہ غالبؔ کو خوب پسند آیا۔ وہ اپنے خطوط اور نظموں میں یہاں کی آب وہوا اور آموں کی خوب تعریف کی ہیں۔ وہ وہاں کے ادبی مشاعروں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ اس شہر میں ان کے کئی اچھے دوست بھی ہو گئے تھے جن سے تاحیات دوستانہ رہا۔ کلکتہ میں غالبؔ کو ایک علمی معرکہ کا بھی سامنا کرنا پڑا جس کا ذکر انہوں ''بادمخالف'' نامی مثنوی میں کیا ہے۔ اسی سفر کے دوران مرزا غالبؔ نے لکھنو میں چند ماہ قیام کیا۔ لکھنو کے اہل علم نے ان کی خوب آو بھگت کی، لیکن بادشاہ غازی الدین حیدر اور اس کے نائب آغا میر کے دربار میں رسائی نہ ہوسکی۔ لکھنو سے کانپور اور الہ آباد کے راستے بنارس پہنچے۔ شہر بنارس مرزا غالبؔ کو بہت پسند آیا اور اس شہر کی تعریف میں فارسی زبان میں ایک مثنوی بعنوان ''چراغ دیر'' تحریر کیا۔ مرزا غالب رام پور دو بار گئے۔ پہلی مرتبہ 1860ء میں رام پور کا سفر کیا۔ نواب یوسف خان غالبؔ کے علمی پرستار اور محسن تھے۔ غالبؔ کی تنگ دستی کے زمانے میں انہوں نے بطور وظیفہ سو روپے ماہ وار مقرر کر دیا۔ نواب یوسف مرزا غالبؔ کے شاگرد بھی تھے۔ رام پور کے اہل علم میں غالبؔ کی بڑی قدر ومنزلت تھی۔ ان کی صحبت سے اہل رام پور مستفیض ہوئیے۔ رام پور کا دوسرا سفر غالب نے 1865ء میں کیا تھا جب نواب یوسف خان کا انتقال ہوا تھا۔ ان کے جاں نشیں نواب کلب علی خان نے بھی غالبؔ کو خوب عزت دی اور ان کی خاطر داری کی۔ انہوں نے بھی غالبؔ کا وظیفہ جاری رکھا۔ 1859ء میں غالبؔ نے میرٹھ کا سفر کیا۔ اس وقت میرٹھ شہر میں ہی غالبؔ کے دوست نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ رہتے تھے۔ ان سے غالبؔ نے ملاقات کی۔ شیفتہؔ اس زمانے کے بڑے بلند مرتبہ لوگوں میں تھے۔ ان کے نام غالبؔ کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ شیفتہؔ سے ان کا والہانہ لگاو تھا۔ شیفتہ کے علاوہ غالب کے معاصرین میں مفتی صدرالدین آزردہ، مومن خاں مومن، ذوق، ظفر اور آغا جان عیش جیسے اہم اور باکمال لوگ شامل تھے۔

7.4 غالب کی غزل ''آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک'' متن کی تشریح

غزل (متن)

1۔ آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

2۔ دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
3۔ عاشقی صبر طلب، اور تمنا بے تاب دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک
4۔ ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک
5۔ پرتو خور سے، ہے شبنم کو فنا کی تعلیم میں بھی ہوں، ایک عنایت کی نظر ہونے تک
6۔ یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک
7۔ غم ہستی کا اسد! کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

تشریح :

1۔ شاعر کہتا ہے کہ میری آہ موثر ضرور ہے لیکن اس کے اثر پذیر ہونے کے لئے ایک بڑی مدت درکار ہے، جب تک تیری زلف میرے قابو میں آئے گی تب تک تو میرا دم ہی نکل جائے گا۔ یعنی محبوب کے نظر التفات تک تو عاشق کا کام تمام ہو جائے گا۔ یعنی میں جو تمہاری یاد میں آہیں بھر رہا ہوں ان آہوں میں اثر ہوگا بھی تو ذرا دیر لگے گی۔ جب تک ہماری آہ اثر کرے گی اور تم ہمارے ہوگے تب تک تو ہم نہ ہوں گے۔ بھلا تب تک کون زندہ رہے گا۔

2۔ یادگار غالب میں مولانا حالی نے لکھا ہے کہ اس شعر میں مطلب جو ادا کیا گیا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ انسان کو درجۂ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نہنگ کے معنی گھڑیال یا مگر مچھ کے ہوتے ہیں۔ سیکڑوں گھڑیال منہ پھیلائے کھڑے ہیں اب دیکھتے ہیں کہ قطرے کو گہر بننے تک اس پہ کیا گزرتی ہے۔

3۔ شاعر کہتا ہے کہ عاشقی ایک صبر طلب کام ہے۔ عاشقی جلدی کا کام نہیں۔ عشق میں بہت صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ معشوق ہر بات مان جائے اور فوراً مان جائے یہ ممکن نہیں ہے۔ اس لئے عاشقی کو صبر طلب کہا گیا ہے لیکن دقت یہ ہے کہ محبوب سے ملنے کی تمنا اسے بے تاب کئے ہوئے ہے۔ عشق میں جگر کا خون تو ہونا ہی ہے لیکن خون جگر ہونے تک اس دل کا کیا کروں؟ دل تو بے تحاشہ ڈھڑک رہا ہے۔ دل تو محبوب سے ملنے کے لیے بے تاب ہے۔

4۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم یہ مان لیتے ہیں کہ تم تغافل نہ کرو گے، یعنی تم جان بوجھ کر ہم کو نظر انداز نہیں کرو گے لیکن تم کو جب تک خبر ہوگی تب تک تو ہم خاک ہو چکے ہوں گے۔ خاک ہونا مطلب مر جانا، مٹی میں مل جانا۔ چونکہ انسان کو اللہ نے مٹی یعنی خاک سے پیدا کیا ہے۔ اس لیے انسان کے مر جانے کو خاک میں مل جانا یا مٹی میں مل جانا کہتے ہیں۔ شعر میں حسن یہ ہے کہ شاعر یعنی عاشق اپنے محبوب سے شکایت کر رہا ہے کہ وہ اسے نظر انداز کرتا ہے۔ لیکن جب معشوق یقین دلاتا ہے کہ وہ نظر انداز نہیں کر رہا ہے تب عاشق ایک نیا پہلو سامنے لاتا

ہے کہ چلو ہم مان لیتے ہیں کہ تم تغافل نہ کرو گے لیکن جب تک تمہارے پاس خبر پہنچے گی تب تک تو ہمارا جنازہ اٹھ چکا ہوگا۔یعنی ہم خاک میں مل چکے ہوں گے۔

5۔ پرتو یعنی سایہ۔مطلب یہ ہے کہ جس طریقہ سے سورج کے پرتو سے شبنم فنا ہو جاتی ہے (دھوپ سے شبنم اڑ جاتی ہے)اسی طریقہ سے اگر آپ کی اک نظر عنایت مجھ پر پڑ جائے گی تو میں بھی فنا ہو جاؤں گا۔شاعر نے پرتو خور کو نظر معشوق سے تشبیہ دی ہے۔

6۔ یعنی اے غافل زندگی کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔گرمیٔ بزم اس سے زیادہ عرصے تک نہیں رہتی۔ جتنا عرصہ کہ ایک چنگاری کو اڑ کر اس کے بجھ جانے میں لگتا ہے۔یعنی یہ دنیا بالکل بے ثبات اور بہت جلد فنا ہو جانے والی ہے۔

7۔ غالب کہتے ہیں کہ اپنی ہستی یا اپنی زندگی میں جو غم ہے اس کا کچھ علاج نہیں ہے۔پھر دوسرے مصرعے میں کہتے ہیں کہ ہاں ایک علاج ہے غم سے نجات کا۔اور وہ علاج موت (مرگ) ہے۔اسی لئے شمع ہر ہال میں صبح ہونے تک جلتی رہتی ہے۔یعنی کسی بھی صورت انسان کو اپنی زندگی مکمل کرنی ہوگی۔اسے ہر حال میں شمع کی طرح جلنا ہوگا۔

(شرح دیوان غالب،از سعید الدین احمد)

7.5 غالب کی غزل ''بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا'' متن کی تشریح

غزل (متن)

1۔ بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
2۔ گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
3۔ وائے دیوانگی شوق، کہ ہر دم مجھ کو آپ جانا ادھر، اور آپ ہی حیراں ہونا
4۔ عشرت قتل گہہ اہل تمنا مت پوچھ عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
5۔ لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا
6۔ کی، مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا !
7۔ حیف، اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

تشریح:

1۔ دنیا میں ہر کام آسان ہو یہ ضروری تو نہیں۔یعنی ہر کام کا آسان ہونا بہت دشوار ہے۔اسی

طرح آدمی اور انسان میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بڑی مشکل سے کوئی آدمی انسان بن پاتا ہے۔ دراصل شاعر مانتا ہے کہ ایک انسان میں سچائی، ایمانداری، شجاعت، فہم، رحم، مروت وغیرہ بہت سی خوبیاں ہونی چاہئے۔ جس شخص میں یہ خوبیاں نہ ہوں وہ ایک آدمی تو نظر آئے گا لیکن وہ انسان نہیں ہے۔

2۔ کاشانہ یعنی چھوٹا گھر، جھونپڑا، یہ تحقیر آمیز جملہ ہے۔ لفظ ٹپکنا گریہ اور گھر کی مناسبت سے بہت قائدے سے لایا گیا ہے۔ چونکہ رونا پیٹنا ویرانی کی علامت ہے۔ اس لیے شاعر کہتا ہے کہ میرے گریہ کی یہ خواہش ہے کہ میں خانہ ویران ہو جاؤں، جیسا کہ اب بھی میرے در و دیوار سے ویرانی ٹپک رہی ہے۔

3۔ یعنی مجھ کو اپنی دیوانگی پر افسوس آتا ہے کہ اس کے تقاضہ سے میں گھڑی گھڑی معشوق کے کوچہ کی جانب جاتا ہوں۔ اور نارسائی کی وجہ سے حیران ہو کر چلا آتا ہوں۔ شاعر یعنی عاشق اپنی اس دیوانگی پر کف افسوس ملتا ہے۔ اس کے در پہ جاتا ہے اور خود ہی حیران ہو کر واپس پلٹ آتا ہے۔ عشق میں عجیب صورت حال ہے۔

4۔ عید نظارہ کا مطلب ہے وہ عید جس میں معشوق کا دیدار نصیب ہو۔ شمشیر عریاں کو ہلال سے تشبیہ دی ہے۔ ہلال یعنی نئے چاند کی صورت شمشیر جیسی ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ مقتل میں عشاق، شمشیر معشوق کو عریاں دیکھ کر عید مناتے ہیں۔ ہلال عید کو شمشیر سے تشبیہ دینا غالب کی شاعری کا کمال ہے۔ معشوق میں بھی شمشیر جیسی تیزی اور کاٹ ہے۔ اسی طرح شمشیر میں جو چمک ہے وہ بھی معشوق کی حصہ ہے۔

5۔ بصد رنگ گلستاں ہونا۔ فرط مسرت سے باغ باغ ہونا۔ غالب کے اس شعر کو بعض شارحین نے مہمل قرار دیا ہے۔ یعنی اس کے معنی کچھ نہیں یا معنی صاف نہیں ہیں۔ شاعر یعنی عاشق اپنے محبوب کو مخاطب کر کے طنزاً کہتا ہے کہ اے محبوب تو خوش ہو کہ ہم نامراد مر گئے۔

6۔ مقام افسوس ہے کہ محبوب نے جب میرا کام تمام کر لیا تب اس نے جفا سے توبہ کی۔ کاش اس کو ذرا دیر پہلے رحم آیا ہوتا۔ غالب نے زود پشیماں کا استعمال بطور طنز کیا ہے۔ محبوب اب نادم ہے، اپنی ندامت اور پشیمانی کا اظہار کر رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ کوئی دیکھے ذرا اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔

7۔ جنون میں عشاق کا گریباں بار بار چاک ہوتا ہے۔ عاشق کا گریبان بار بار چاک ہوتا ہے۔ کبھی تو محبوب گریبان پکڑ کر پھاڑ دیتا ہے اور کبھی عاشق خود اپنا گریباں چاک کرتا ہے۔ چار گرہ کپڑے کی قسمت پر شاعر نے رشک کیا ہے۔ گرہ کپڑا ناپنے کا ایک چھوٹا پیمانہ ہے۔ جیسے گز یا میٹر سے کپڑا ناپتے ہیں اسی طرح گرہ کا رواج بھی تھا۔ کپڑے کے اس چھوٹے ٹکڑے

کی قسمت پر شاعر رشک کرتا ہے۔یعنی گریبان عاشق اور معشوق کے درمیان ایک نا قابل فراموش شئے ہے۔

(شرح دیوان غالب از سعید الدین احمد)

7.6 غالب کی غزل ''پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا'' متن کی تشریح

غزل (متن)

1۔ پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا دل ، جگر تشنۂ فر یاد آیا
2۔ دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقت سفر یاد آیا
3۔ سادگی ہائے تمنا ، یعنی پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا
4۔ عذر واماندگی ، اے حسرت دل نالہ کرتا تھا، جگر یاد آیا
5۔ زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی کیوں ترا راہگزر یاد آیا
6۔ کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
7۔ پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال دل گم گشتہ مگر یاد آیا
8۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ! دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
9۔ میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

تشریح :

1۔ عاشق کہتا ہے کہ مجھ کو پھر اپنا دیدۂ تر یاد آیا۔یعنی گریۂ عشق میں رونے کی جو لذت تھی وہ پھر یاد آئی۔اور دل وجگر میں فریاد کی خواہش پیدا ہوئی کہ نالہ کروں اور روؤں لیکن یار گریہ نہیں ہے کہ دل وجگر کا سارا خون آنسوؤں کی راہ پہلے ہی بہا چکا تھا۔شارحین نے دیدۂ تر سے معشوق کا دیدۂ تر مراد لیا ہے۔

2۔ ''دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گزری تھی اس کو ''قیامت'' کہا ہے۔اور جو اس کے چلے جانے کے بعد رو رو کر یاد آتی ہے اس میں جو کبھی کبھی وقفہ ہو جاتا ہے اس کو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا ہے۔''(یادگار غالب)

3۔ پہلے مصرعہ میں لفظ ''دیکھو'' محظوف ہے۔نیرنگ نظر۔معشوق شوخ۔مطلب یہ ہے کہ میری تمنا وصل معشوق کی سادگی ذرا ملاحظہ کیجئے کہ وہ ایک مرتبہ اس کو معشوق کی طرف سے ناکامیابی اور مایوسی ہو چکی ہے لیکن پھر وہی یاد آتا ہے۔یا یہ کہ جس نے مجھے تباہ کر کے ایسی خستہ حالت پہ پہنچا دیا میری آرزوئیں اسی نیرنگ نظر کو یاد کرتی ہیں۔

4۔ عذر داماندگی کے بعد ''قبول کر'' محظوف ہے۔مطلب یہ ہے کہ حسرت دل اس بات کی متقاضی تھی کہ نالہ کیا جائے اس لیے میں نالہ کرنے والا ہی تھا کہ جگر یاد آ گیا۔کہ ایسا نہ ہو کہ (نالہ کے صدمہ سے) وہ شق ہو جائے اس سبب میں چپ ہو گیا۔اے حسرت دل میرے اس عذر داماندگی کو قبول کر۔

5۔ یعنی ہماری زندگی یوں بھی کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جاتی۔فضول تیرا رہ گزر کیوں یاد آیا کہ اس کو یاد کر کے ہم مر گئے۔

حسرت صاحب اس کے معنی اس طرح بیان فرماتے ہیں۔''جب کامگاری ممکن ہی نہیں تو تیرا رہگزر بے کار ہی یاد آتا ہے۔یعنی جب وہاں بھی بحالت ناکامیابی بسر ہوگی تو یاد آنا عبث ہے۔یوں بھی زندگی کسی نہ کسی طور پر گزر ہی جاتی۔''

6۔ کیا ہی لڑائی ہوگی،یعنی خوب لڑائی ہوگی۔اس بنا پر کہ وہ کہے گا کہ بہشت اچھی ہے اور میں کہوں گا کہ نہیں میرے معشوق کا گھر اچھا ہے۔مرزا ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

کم نہیں جلوہ گری میں تیرے کوچہ سے بہشت
یہی نقشہ ہے مگر اس قدر آباد نہیں

7۔ گم گشتہ،کھویا ہوا۔مگر شاید۔مطلب یہ ہے کہ شاعر کھوئے ہوئے دل کو ڈھونڈھنے کی غرض سے اس کی کوچہ کی طرف چلا ہے کیوں کہ وہیں دل کے کھوئے جانے کا احتمال ہے۔

8۔ ''اس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے۔یعنی خوف معلوم ہوتا ہے۔(چلو گھر کو لوٹ چلیں) مگر ذرا غور کرنے کے بعد اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر کو ہی سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہیں ہوگی مگر دشت بھی اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے۔گھر یاد آنے میں صنعت ایہام ہے۔''(یادگار غالب)

9۔ سر یاد آیا یعنی اپنے ہی سر میں مار لیا یا یہ کہ مجھ کو یہ خیال گزرا کہ ممکن ہے کہ میں بھی مجنوں کی طرح جنون عشق میں مبتلا ہو جاؤں۔اور لڑکے میرے سر پر بھی اسی طرح سنگ زنی کریں اور اس خیال سے اس کو پھینک دیا۔

(شرح دیوان غالب از سعید الدین احمد)

7.7 غالب کی غزل ''دردمنت کش دوا نہ ہوا'' متن کی تشریح

غزل (متن)

1۔ درد منت کش دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
2۔ ہے خبر گرم ان کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
3۔ کیا وہ نمرود کی خدائی تھی بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
4۔ جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
5۔ زخم گر دب گیا ، لہو نہ تھما کام گر رک گیا ، روا نہ ہوا
6۔ کچھ تو کہیئے کہ لوگ کہتے ہیں آج غالب غزل سرا نہ ہوا

تشریح :

1۔ یعنی اگر مجھ کو صحت نہ ہوئی تو کوئی حرج نہیں کیوں کہ میں دوا کے احسان سے بچ گیا۔

2۔ اس سے مدارات اور مفلسی کا اظہار ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ پہلے میرے پاس ایک بوریہ تو تھا لیکن اب جب کہ ان کے آنے کی خبر مشہور ہے تو شومئی قسمت سے وہ بوریہ بھی نہیں رہا۔

3۔ کہتا ہے کہ میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھ کو سوائے نقصان کے کچھ فائدہ نہ پہنچا۔ یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں ہے بلکہ عبودیت ہے۔ بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے۔'' (یادگار غالب)

4۔ پہلے حق کے معنی سچ اور دوسرے حق کے معنی فرض کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم نے خدا کی راہ میں جان بھی دے دی تو بھی ہم سے پورا پورا فرض ادا نہیں ہوا۔ کیوں کہ جان اسی کی دی ہوئی تھی۔ اگر اسی کی راہ میں دے بھی دی تو کیا ہے؟ کسی کی دی ہوئی چیز کا واپس کر دینا کوئی ذاتی ایثار اور قربانی نہیں ہے۔

5۔ کام جب رک جاتا ہے تو مشکل سے پھر روا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے چاہئے تھا کہ زخم اگر دب گیا تو پھر لہو بھی رک جاتا۔ لیکن میرے حق میں ایسا نہیں ہے۔ زخم کے دب جانے پر بھی لہو جاری ہے۔

6۔ اس شعر کا ایک پہلو یہ ہے کہ غالب کو اپنی عظمت کا خوب اندازہ ہے۔ شاعر خاموش ہے لیکن پھر اسے خیال آتا ہے کہ اس کی خاموشی سے ہر طرف سناٹا ہے۔ لوگ گزارش کر رہے ہیں کہ حضور کچھ تو کہیئے کہ لوگ پوچھ رہے ہیں۔ سب لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ آج غالب کیوں غزل سرا نہ ہوا؟ (شرح دیوان غالب از سعید الدین احمد)

7.8 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ

- مرزا غالبؔ کی شخصیت سے واقف ہوئے۔
- مرزا غالبؔ کی حالات زندگی کو تفصیل سے جانا اور سمجھا۔
- مرزا غالبؔ کے معاصرین کے بارے میں واقفیت حاصل کی۔
- غالبؔ کی ادبی خدمات کے بارے میں تفصیل سے سمجھا۔
- غالبؔ کے عادات واطوار اور ان کے اسفار کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔
- منتخب کلام غالب کی تشریح پڑھ کر اشعار میں پوشیدہ جہان معنی کی تلاش کی

7.9 اپنا امتحان خود لیجئے

1۔ غالبؔ کب اور کس شہر میں پیدا ہوئے بتائے؟

2۔ غالبؔ کے والدین کے نام بتائے؟

3۔ غالبؔ کی شادی کب اور کس سے ہوئی اس پر روشنی ڈالیے؟

4۔ مرزا غالبؔ رام پور کتنے بار گئے؟ اور کلکتہ کا سفر کیوں کیا تھا؟

5۔ غالبؔ کے پانچ معاصرین ادیبوں کے نام بتائے؟

7.10 سوالات کے جواب

1۔ غالبؔ کی ولادت 27 دسمبر 1797 کو شہر آگرہ میں ہوئی۔

2۔ مرزا غالب کے والد کا نام مرزا عبداللہ بیگ خاں اور والدہ کا نام عزت النسا بیگم ہے۔

3۔ غالبؔ کی شادی 1810ء میں 13 سال کی عمر میں امراؤ بیگم سے ہوئی۔ اس وقت امراؤ بیگم کی عمر محض 11 سال کی تھی۔

4۔ غالبؔ رام پور دو بار تشریف لے گئے۔ پہلی دفعہ 1860ء میں جب نواب یوسف علی خان رام پور کے والی تھے۔ دوسری بار غالبؔ نے 1865ء میں رام پور کا سفر کیا جب نواب یوسف علی خان کا انتقال ہوگیا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے تعزیت پیش کی۔

5۔ غالبؔ کے معاصرین ادیبوں میں استاد شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، شاہ نصیر، مومن خان مومنؔ، بہادر شاہ ظفرؔ اور نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ کے نام اہم ہیں۔

7.11 فرہنگ

لفظ	معنی
عہد	زمانہ، سال
آفاقی	ساری دنیا کا، عالمگیر
حامل	بوجھ اٹھانے والا
دانشور	علم والا، عقل والا
مصنف	تصنیف کرنے والا، کتاب لکھنے والا
فطری	پیدائشی
ہمہ جہت	ہر اعتبار سے
نثر نگار	نثر لکھنے والا
آبرو	عزت
شناخت	پہچان
نوشہ	دولہا
تخلص	شاعر کا وہ مختصر نام جو مقطع میں استعمال کرتا ہے
خطابات	بادشاہ یا سرکار کی طرف سے اعزازی نام، واحد: خطاب
قبائل	گروہ، فرقہ
زوال	نقصان، اتار، تنزلی
بساط	بستر، بچھونا، فرش
سپہ گری	سپاہی کا کام یا پیشہ
سکونت	کسی مقام یا کسی ملک میں بحیثیت شہری مستقل طور پر قیام
وفات	موت
پرورش	دیکھ بھال، پال پوس
صوبے دار	ریاست کا گورنر
رسالدار	ایک رسالے کا افسر، سو سواروں کا افسر
محروم	منع کیا گیا، روکا گیا
خسر	سسر، بیوی کا باپ
کہنہ مشق	ماہر، تجربہ کار، منجھے ہوئے

ایام	یوم کی جمع، دن
متبنّٰی	متبنی بنانے والا باپ، گود لینے والا
سانحہ	واقعہ، حادثہ
طفولیت	بچپن، بالکپن ۔لڑکپن
قمار بازی	جوا کھیلنا۔شرطیہ بازی
خفا	ناراض
خودداری	غیرت، ثابت قدمی
معلم	استاد
تجویز	رائے، مشورہ
حیوان ظریف	خوش طبع ۔ہنس مکھ
خوش اخلاق	عمدہ اخلاق
صاف گو	سچا، کھری بات کہنے والا
ملازمت	نوکری
عہدہ	منصب، مرتبہ
استقبال	خوش آمدید
سنگ میل	میل کا پتھر جو راہ گیروں کی رہنمائی کا کام کرتا ہے
آفتاب	سورج
غروب	ڈوب جانا
حکمراں	برسر اقتدار، صاحب حکومت
عینی	آنکھوں دیکھا
دل دادہ	فریفتہ، عاشق، گرویدہ
چشم پوشی	آنکھ چرانا، نظر انداز کرنا
مرعوب	ڈرا ہوا
مستقل	ہمیشہ کے لیے
پنشن	وظیفہ
چارہ جوئی	فریاد، نالش
دارالحکومت	راجدھانی
منت وسماجت	پیروی، التجا

سفارش	کسی کی بھلائی یا مطلب برآری کے لیے دوسرے سے کلمات خیر کہنا۔
معرکہ	لڑائی، جنگ
قیام	مقیم۔فروکش، مستقل ایک حالت پر قائم
ماہ وار	ہر مہنے، مہینے کے مہینے
مستفیض	فیض یاب، فیض اٹھایا
جاں نشیں	سلطنت کے نائب

7.12 کتب برائے مطالعہ

1۔	الطاف حسین حالی	یادگار غالب	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، 1986
2۔	شمس الرحمٰن فاروقی	تفہیم غالب	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، 2006
3۔	شان الحق حقی	آئینہ افکار غالب	ادارہ یادگار غالب کراچی، 2001
4۔	عبادت بریلوی	غالب اور مطالعہ غالب	سکسینہ پبلشنگ ہاؤس دہلی، 1970
5۔	مولانا غلام رسول مہر	دیوان غالب	شیخ غلام علی اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلیشر لاہور، 1967
6۔	مختار الدین احمد	احوال غالب	انجمن ترقی (ہند) دہلی، 1953
7۔	آغا محمد باقر	بیان غالب	کتابی دنیا دہلی، 2000
8۔	تنویر احمد علوی	غالب کی سوانح عمری	غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی، 2004
9۔	اسلوب احمد انصاری	نقش ہائے رنگ رنگ	
10۔	ڈاکٹر عقیل احمد دیوان	غالب اردو غالب اکیڈمی	بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی 2001

اکائی 8 غالب کی قصیدہ گوئی

ساخت

8.1 اغراض ومقاصد

8.2 تمہید

8.3 قصیدے کی تعریف

8.4 قصیدے کی اجزائے ترکیبی

8.5 غالب کی قصیدہ گوئی

8.6 آپ نے کیا سیکھا

8.7 اپنا امتحان خود لیجیے

8.8 سوالات کے جواب

8.9 فرہنگ

8.10 کتب برائے مطالعہ

8.1 اغراض ومقاصد

اِس اکائی میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کی جائے گی

- قصیدے کی تعریف
- قصیدے کی اجزائے ترکیبی
- قصیدہ نگاروں کا مختصر جائزہ
- غالب کی قصیدہ گوئی
- اکائی میں استعمال کیے گئے الفاظ کے معنی

8.2 تمہید

قصیدہ، اصنافِ سخن میں، بلاغتِ فکر، شوکت بیان اور پُر شکوہ مضمون کے سبب امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ بادشاہ وامراء کے زیر سایہ اس صنف کو بے پناہ ترقی حاصل ہوئی۔ اُردو میں قصیدہ ایک مخصوص معاشرے کے لیے لکھا جانے لگا۔ قصیدہ سلاطین وامراء اور دیگر رئیس جن کی مدح میں لکھا جاتا تھا وہ کافی انعام واکرام سے شعرا کو فیض یاب کرتے تھے۔ اس لیے بہت سے شعرا نے قصیدہ گوئی کو اپنا ذریعہ معاش بنایا اور وہ لوگ قصیدہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے قصیدہ میں ہی

تمام کمالِ شاعری دکھانا شروع کیا۔ شعرا کے ہاں اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے اور معاشرے میں اپنا وقار قائم کرنے کے لیے اپنے فضل وکمال کا سکہ جمانے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور طریقہ بھی نہ تھا۔ سلاطین، نوابین اور امراء کی معاشرے میں ایک امتیازی حیثیت تھی۔ اور ان کا تقرب قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، گو کہ صاحبِ اقتدار لوگوں سے صلہ وانعام حاصل کرنا، موجودہ دور میں برا سمجھا جاتا ہے۔ مگر شخصی وسامنتی نظام میں صلہ وانعام کے متعلق دوسرا نظریہ تھا۔ اسی زمانے میں وظیفہ وصلہ وانعام سے اہل فن کی سماجی حیثیت اور قدر ومنزلت میں کافی اضافہ ہوتا تھا۔ چنانچہ قصیدہ کے اغراض ومقاصد اسی زمانے میں سوائے اس کے کہ ممدوح کی تعریف کر کے اور اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کر کے اسی صلہ وانعام اور دیگر مراعات حاصل کی جائیں۔ اسی لیے ہر بڑا شاعر قصیدہ گوئی کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اس کے اندر اپنا کمالِ فن دکھانے لگا۔ اس طرح قصیدہ گوئی اس عہد میں بہت عروج پر پہنچی اور جو ترقی ہوئی اسی سے اُردو ادب وشاعری کو بہت فائدہ پہنچا۔

8.3 قصیدے کی تعریف

قصیدہ اُس صنفِ نظم کو کہتے ہیں، جس میں کسی کی تعریف یا برائی بیان کی جائے۔ قصیدہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ قصیدہ لفظ قصد سے نکلا ہے اور اس کے لغوی معنی اِرادہ کرنے کے ہیں۔ قصیدہ ایک ایسی طرز شاعری ہے، جس میں کسی صاحبِ شخصیت کی تعریف کی جاتی ہے اور اسے مدحیہ قصیدہ کہا جاتا ہے اس کے بجائے کسی شخصیت کی تذلیل کی جائے تو اِسے ہجو یہ قصیدہ کہا جاتا ہے۔ یعنی قصیدہ جیسی صنفِ شاعری میں مدح یعنی تعریف اور ہجو یعنی تذلیل دونوں طرح کے انداز اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ قصیدے کی اہمیت اس بات میں ضرور مضمر ہے کہ ہئیتی نقطہ نظر سے غزل جیسی شاندار صنفِ سخن اسی کے بطن سے پیدا ہوئی۔ لہٰذا اس کی ہیئت بڑی حد تک وہی ہے جو غزل کی ہیئت ہے۔

8.4 قصیدے کی اجزائے ترکیبی

قصیدے کی ادبی وتاریخی حیثیت بہت بلند ہے۔ قصیدہ چار حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جسے قصیدہ کے اجزائے ترکیبی یا عناصرِ ترکیبی کہتے ہیں۔

1۔ تشبیب　　2۔ گریز　　3۔ مدح　　4۔ دعا

[1] تشبیب:

قصیدے کے ابتدائی اشعار کو تشبیب کہتے ہیں، جو کہ لفظ شباب سے مشتق ہے جسے نسیب بھی کہا گیا ہے جس کے معنی حسنِ نسوانی کا ذکر۔ قصیدہ چوں کہ غزل کی ہیئت میں لکھا گیا اس وجہ سے یہ ہیئت اس کے ساتھ مخصوص رہی اور غزل کے سارے آدابِ سخن اس میں برتے گئے بلکہ قصیدے میں غزل

سے زیادہ اہتمام کیا گیا اسی لیے تشبیب میں پہلے شعر کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔قصیدے کی تشبیب کا پہلا شعر چوں کہ خود قصیدے کا پہلا شعر ہوتا ہے اور دونوں مصرعے ہم قافیہ ہونے کی وجہ سے مطلع کہلاتے ہیں اس لیے اسے پُر شکوہ اور جدّتِ خیال کا حامل ہونا چاہیے تا کہ اسے سنتے ہی ممدوح ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو جائے اور بعد میں آنے والے اشعار خوش گوار اثرات چھوڑ سکیں ۔ روایت کے مطابق عربی شعرا تشبیب کے باب میں عشقیہ موضوع کو نظم کیا کرتے تھے۔مگر اُردو اور فارسی شعرا نے تشبیب کو محض عشقیہ موضوع تک محدود نہیں رکھا۔اس میں اور بھی بہت وسعت پیدا کی گئی ہے۔تشبیب معنی آگ بھڑکانے کے مترادف ہے یعنی تشبیب جتنی مضبوط، موقر، عمدہ اور خوبصورت ہوگی آگے کی منزلیں اسی قدر جامعیت کی حامل ہوں گی۔اس باب میں بے ثباتی، دنیا، پند ونصائح، حکمت ونجوم، منطق وفلسفہ، تصوف واخلاق، موسم بہار، شعر وموسیقی کے مباحث رندی و سرمستی کی کیفیات اُمید ویقین، جوش و ولولہ اور قدر وتہذیب کے متعلقہ مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔

قصیدہ نگار کا اصل مدعا یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ممدوح کی تعریف کر کے اسے خوش کر دے تا کہ اس کے عوض اسے کچھ صلہ وانعام حاصل ہو جائے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ ممدوح کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے اور اس کے دل میں اپنے واسطے ایک نرم گوشہ بنانے کے لیے فضا تیار کی جائے۔اسی لیے قصیدے میں تشبیب کا ایک اہم نفسیاتی جواز ہے کہ ممدوح کے منصب کے نہ صرف مطابق ہوں بلکہ بعد میں آنے والے مدحیہ اشعار سے معنوی ربط ومناسبت بھی رکھتے ہوں۔قصیدے میں تشبیب کے پُر شکوہ اشعار بہ طور مثال ملاحظہ کیجیے:

صبح دم، دروازۂ خاور کھلا
مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا
خُسرِدِ انجم کے آیا صرف میں
شب کو تھا، گنجینۂ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو راز مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا، یہ بازی گر کھلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو
موتیوں کا، ہر طرف زیور کھلا

(بہ حوالہ: قصیدہ در مدح بہادر شاہ ظفر۔ مرزا غالب، انتخاب قصائد۔ اتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ، ص: 94)

[2] گریز:

گریز کے معنی بھاگنا ہے۔ قصیدہ گو اسی کے ذریعے مدح کی طرف گریز کرتا ہے۔ تشبیب کے بعد نفس مطلب کی طرف ''گریز'' ہوتی ہے۔ گریز کا حصہ عموماً مختصر ہوتا ہے۔ شاعر ایک دوسرے مضمون کو بیان کرتے کرتے، فن کارانہ طور پر نہایت ہوشیاری اور چابک دستی سے اپنے نفس مطلب یعنی ممدوح کی تعریف و توصیف کا آغاز اس طرح کر دیتا ہے کہ دونوں حصے ایک دوسرے سے مل جاتے اور غور کرنے پر بھی تشبیب کا حصہ ''گریز'' کی ساحرانہ کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ اصطلاح میں ''گریز'' کو دو سرکش بیلوں کو ایک جوے میں جوتنے کے معنی میں لیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑی مہارت کی بات ہے۔ گریز کا عنصر قصیدے کے دیگر اجزا کے بہ مقابلے بہت مختصر ہوتا ہے۔ گریز کی مثال دیکھیے:

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال
پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا
خامہ نے، پائی طبیعت سے مدد
بادباں بھی، اُٹھتے ہی لنگر کھلا
مدح سے، ممدوح کی دیکھی شکوہ
یاں، عرض سے رتبہ، جوہر کھلا

(بہ حوالہ: قصیدہ در مدح بہادر شاہ ظفر۔ مرزا غالب، انتخاب قصائد۔ اتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ، ص: 96)

[3] مدح:

گریز کے بعد کی منزل مدح کہلاتی ہے۔ مدح قصیدے کا تیسرا لیکن اصل عنصر اور خاص مدعا و مقصد ہے۔ اسی کے لیے شاعر قصیدے کی عالی شان عمارت کھڑی کرتا ہے۔ اس میں ممدوح کی ذات کے جملہ اوصاف کا بیان کیا جاتا ہے۔ اور شاعرانہ خیال کے خوب خوب جوہر فشانی کی جاتی ہے لیکن مدح میں حفظِ مراتب کا خیال بہ طور خاص رکھا جاتا ہے کہ اشعار ممدوح کے شایانِ شان ہوں۔ مدح میں بالعموم ممدوح کے جاہ و جلال، دولت و امارت، دبدبہ، قناعت، راست گوئی، علم و اخلاق، حسن و جمال، قد و قامت وغیرہ کی تعریف کی جاتی ہے لیکن یہ حصہ بہت احتیاط طلب ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

قبلۂ چشم و دل، بہادر شاہ
مظہر ذوالجلال والاکرام
شہ سوار طریقہ انصاف
نو بہار حدیقۂ اسلام

جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز
جس کا ہر قول، معنی الہام

(بہ حوالہ: قصیدہ در مدح بہادر شاہ ظفر۔ مرزا غالب، انتخاب قصائد، اُتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ، ص: 93)

[4] دعا:

یہ قصیدے کا اختتامیہ حصہ ہوتا ہے۔ اس میں شاعر اپنے ذاتی حالات اور اغراض و مطالب کا بیان کرتا ہے۔ مدح و تعریف کی داد طلب کرنے کے علاوہ مالی منفعت اور صلہ و اکرام کا حصول بھی اس کا خاص مقصد ہوتا ہے۔ اشعار دیکھیے:

تیری توقیعِ سلطنت کو بھی
دی بدستور صورتِ ارقام
کاتبِ حکم نے بہ موجبِ حکم
اس رقم کو دیا طراز دوام
ہے ازل سے ردائے آغاز
ہو ابد تک، رسائی انجام

(بہ حوالہ: قصیدہ در مدح بہادر شاہ ظفر۔ مرزا غالب، انتخاب قصائد، اُتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ، ص: 94)

8.5 غالب کی قصیدہ گوئی

قصیدہ پُر وقیع صنفِ سخن ہے۔ اُردو کی تمام اصنافِ سخن کے ابتدائی نمونے دکن سے ہی دستیاب ہوئے۔ بہمنی سلطنت، قطب شاہی اور عادل شاہی دور میں قصیدہ نگاری کو فروغ حاصل ہوا۔ قلی، نصرتی، سودا، انشا، ذوق، مومن اور غالب اُردو ادب میں باکمال قصیدہ گو شعرا کی حیثیت سے خاص پر قابلِ ذکر ہیں۔ ارضِ دکن کے قصیدہ نگاروں میں قلی، عادل، غواصی، نصرتی، وجہی اور ولی کو اہمیت حاصل ہے۔ قلی قطب شاہ نے عید، عیدِ قرباں، بسنت کے موضوعات پر موثر قصائد تخلیق کیے۔ ان قصیدوں کی زبان دکنی ہے۔ نصرتی، عادل شاہ ثانی کا درباری شاعر تھا۔ ایک قصیدہ علی عادل شاہ کی مدح میں ایک معراج کے ضمن میں مشہور ہیں۔ ولی اورنگ آبادی کے قصائد، اخلاق و تصوف، علم نجوم، اور موسیقی کے لوازمات کے ذکر پر مبنی ہیں۔ مرزا رفیع سودا اور شیخ محمد ابراہیم ذوق اُردو قصیدہ نگاری کے بے حد اہم نام تھے۔ سودا اور ذوق ہم رتبہ سمجھے جاتے ہیں۔ دونوں کے قصائد کے مضامین میں تنوع، بیان میں زور اور علمیت خاص طور سے نمایاں ہے۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے قصیدے میں اپنا جو راستہ چنا وہ ان کا اپنا ڈھونڈا ہوا نیا راستہ تھا۔ دیوانِ غالب میں صرف چار قصیدے ہی شامل ہیں۔ دو حضرت علیؓ کی منقبت میں اور دو بہادر شاہ ظفر کی

مدح میں۔ مذکورہ قصائد میں ندرتِ خیال، شوخی، حکمت اور دلائل و اثبات کی باتیں موجود ہیں۔ قصیدے میں غالب اعلیٰ مقام رکھتے ہیں جب کہ ان کے قصیدوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ان کے قصیدوں میں غزل کی طرح بہت جدت ہے۔ غالب کے اول دو قصیدے ابتدائی دور کے ہیں۔ جس میں انھوں نے حضرت علیؓ کی منقبت لکھی ہے۔ دونوں قصائد میں فکری بلندی زورِ بیان، مبالغہ آرائی، متانت و سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ تشبیب کے مضامین میں بہت جدت ہے۔ اس کی ابتدا ہی نرالی ہے۔ تشبیب میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ اشعار حسبِ مراتب ممدوح ہوں۔ اگر اشعار عاشقانہ بھی ہوں تو مہذب اور باوقار ہوں اور امرا اور سلاطین کی مدح میں تو ایسے اشعار تشبیب میں لائے جاسکتے ہیں مگر مقدس لوگوں کے لیے اس قسم کی تشبیب گستاخی و بدتمیزی سمجھی جاتی ہے۔ غالب نے منقبت میں قصیدے لکھے ہیں۔ انھوں نے قصیدے میں تشبیب کا بہت خیال رکھا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی تشبیب دونوں قصائد میں بہت اعلیٰ ہے۔ تسلسل تشبیب کی روحِ رواں اور قصیدہ کا عین کمال ہے۔ یہ اہم بات غالب کی تشبیب میں خوب اچھی طرح نمایاں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ منقبت میں لکھے ہوئے جو دو قصیدے ہیں یہ ان کے ابتدائی دور کے ہونے کی وجہ سے ان میں اکثر اشعار پورے فارسی میں ہیں۔ مشکل پسندی اور بلند پروازی کی کوشش میں خیال و بیان دونوں میں تکلف و تصنع بہت پایا جاتا ہے۔ منقبت کے دوسرے قصیدے میں باوجود مشکل پیرایۂ بیان کے معانی زیادہ واضح ہیں اور زورِ بیان اور شوکتِ الفاظ کے ساتھ شاعرانہ انفرادیت زیادہ ٹپکتی ہے۔ تمہید میں کائنات کی نفی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

دہر، جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے؟ اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

منقبت میں تخیل کی بلندی اور نیا پن بھی ملاحظہ کیجیے:

کس سے ممکن ہے تری مدح، بغیر از واجب؟
شعلۂ شمع، مگر شمع پہ باندھے آئیں
آستاں پر ہے ترے، جوہرِ آئینہ سنگ
رقم بندگیٔ حضرت جبریلِ امیں

تلوار کی تعریف بھی دیکھیے:

بُرشِ تیغ کا اُس کی، ہے جہاں میں چرچا
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

غالب کا کمال ان کے دو قصیدوں میں جو انھوں نے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں لکھے ہیں، زیادہ نمایاں ہے۔ ان میں ندرتِ خیال اور شان و شکوہ کے ساتھ ساتھ تسلسلِ بیان، روانی اور برجستگی بھی موجود ہے۔ ان کے مختلف اجزا میں غالب نے بڑا اچھوتا انداز اختیار کیا ہے۔ تشبیب و گریز میں بڑی جدت و برجستگی

بتائی ہے۔ مدح میں اختصار و جامعیت انتہائے کمال پر ہے۔ ان کا پہلا قصیدہ جس کا مطلع ہے:

ہاں مہ نو سنیں ہم اُس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

سطور بالا کا شعر بڑی جدت سے بھرا ہے۔ اس کی تشبیب گو کہ عاشقانہ ہے مگر بالکل نرالی ہے۔ بہ قول نظم طباطبائی ''اس کی تشبیب غالب کے کمال کا ایک کارنامہ اور زیور ہے۔'' اُردو شاعری کے لیے اسی زبان میں جب سے قصیدہ گوئی کا آغاز ہوا ہے اس طرح کی تشبیب کم لکھی گئی ہے۔ ایسی تشبیب میں غالب نے ایک دلچسپ مکالمہ سپرد قلم کیا ہے۔ گریز کے اشعار بھی بہت برجستہ ہیں۔ مدح کے بعد دعا پر خاتمۂ کلام کیا ہے۔ دعا بھی نہایت جامع ہے:

ہے ازل سے ردائِ آغاز
ہو ابد تک، رسائِ انجام

مدح میں غالب نے ممدوح کے جاہ و جلال، شجاعت و بہادری عدل و انصاف، تیر، تلوار، گھوڑے اور ہاتھی سب کی تعریف کی ہے لیکن طول کلام سے گریز کیا ہے اور ایک ایک مضمون کو ایک ایک شعر ایک ایک مصرع میں پیش کیا ہے۔ وہ بے جا بہت زیادہ تعریف سے ہمیشہ دور رہے۔ اسی قصیدے میں غالب نے غزل شامل کی ہے۔ اس کا لب و لہجہ بھی قصیدہ کی شان سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ دوسرے قصیدے کی تشبیب بھی بہت مختصر، لیکن انداز وہی ہے:

صبح دم، دروازۂ خاور کھلا
مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا
مہر کانپا، چرخ چکر کھا گیا
بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ
اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا

غالب کے قصیدے اپنا انفرادی رنگ رکھتے ہیں۔ ان کے اندر بے پناہ روانی، سلاست اور شیرینی ہے۔ وہ دیگر قصیدہ نگاروں سے ممتاز اور منفرد نظر آتے ہیں۔ غالب اپنے قصائد میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ ایک مدحیہ قطعہ کی دعا تو ضرب المثل بن گئی ہے:

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

8.6 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے سیکھا کہ

- قصیدہ کسے کہتے ہیں۔یعنی قصیدے کی تعریف کیا ہے؟
- قصیدے میں تشبیب ،گریز، مدح اور دعا سے کیا مراد ہے؟
- قصیدے کی اُردو ادب میں کیا سمت ورفتار ہے؟
- قصیدے کا آغاز اور پس منظر کیا ہے؟
- اُردو کے قصیدہ گوشعرا کا اجمالی تعارف کیا ہے؟

8.7 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ قصیدے میں تشبیب اور گریز سے کیا مراد ہے؟

2۔ اُردو کے دو اہم قصیدہ گوشعرا کے نام لکھیے ؟

3۔ دو ایسے شاعروں کے نام بتائیں جو غزل اور قصیدے کے بڑے شاعر ہیں؟

4۔ قدیم قصیدہ گو دو شعرا کے نام لکھیے ؟

5۔ غالب اور ذوق کے قصائد کا فرق کیا ہے؟

8.8 سوالات کے جواب

1۔ قصیدے میں پہلے حصے کو ''تشبیب'' اور دوسرے حصے کو ''گریز'' کہتے ہیں۔

2۔ اُردو کے دو اہم قصیدہ گوشعرا، سودا اور ذوق ہیں۔

3۔ غالب اور ذوق غزل اور قصیدے کے بڑے شاعر ہیں۔

4۔ قدیم قصیدہ گوشعرا، قلی قطب شاہ اور نصرتی ہیں۔

5۔ ذوق نے قصیدے میں تشبیب میں ندرت اور پُرکاری سے کام لیا ہے۔روانی پر بہت زیادہ توجہ دیتے ہیں۔غالب کے قصیدے میں تشبیب و گریز میں جدت و انفرادیت ہے۔مدح مختصر سنجیدہ و باوقار ہے۔

8.9 فرہنگ

لفظ	معنی
امرا	امیر کی جمع/دولت مند لوگ
تقرب	نزدیکی ڈھونڈنا/قرب

سامنتی	جاگیردارانہ نظام کے ماننے والا
ممدوح	تعریف کیا گیا/جس کی تعریف کی جائے
بطن	پیٹ/شکم
موقر	معزز/عزت دار/حرمت والا
تصوف	علم معرفت/صوفیوں کا عقیدہ
جدت	نیاپن/تازگی/نیا ہونا
پُرشکوہ	عظمت والا/عظیم الشان
تنوع	قسم قسم کا ہونا/مختلف رنگ کا ہونا
قصائد	قصیدہ کی جمع
منقبت	تعریف/توصیف/ثنا
شوکتِ الفاظ	زوردار الفاظ
ممتاز	معزز، اعلیٰ، افضل، برتر
منفرد	تنہا/اکیلا
سلاست	نرمی/روانی/صفائی
برجستہ	چست/ٹھیک
سپردِ قلم	قلم کے حوالے کرنا
تذلیل	ذلیل ورسوا کرنا/ذلت

8.10 کتب برائے مطالعہ

1۔	مسعود حسین (مرتبہ)	انتخابِ کلام غالب	سرسید بک ڈپو علی گڑھ، 1991
2۔	مجلسِ مشاورت	انتخابِ قصائد	اتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ، 1986
3۔	ڈاکٹر اُم ہانی اشرف	اُردو قصیدہ نگاری	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1995
4۔	فخر الاسلام اعظمی	غالب: فکر وفن	شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ، 1986
5۔	ساحل احمد	اُردو قصیدہ: ایک مطالعہ	اُردو رائٹرس گلڈ، الٰہ آباد، 1998

6۔	شمیم احمد	اصنافِ سخن اور شعری ہیئتیں	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2014
7۔	پروفیسر مجید بیدار	اُردو کی شعری و نثری اصناف	انجمن ترقی اُردو شاخ حیدرآباد، 2014